حکومت بہار

اردو ڈائرکٹوریٹ

بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔۲۲

احمد یوسف

ڈاکٹر آصف سلیم

Monograph-22

Ahmad Yusuf

By : Dr. Asif Saleem

اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں احمد یوسف کا نام نمایاں اور محترم ہے۔ وہ عظیم آباد کی تہذیبی روایات اور اخلاقی اقدار کے امین تھے اور تاحیات انھوں نے اس کی پاسداری کی۔

احمد یوسف کا اصل نام سید عثمان احمد یوسف تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۳۰ء میں پٹنہ سیٹی کی مردم خیز سرزمین پر ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم کلکتے میں ہوئی۔ کیوں کہ وہاں ان کے والد کا سائیکل کا بڑا کاروبار تھا۔ پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ناسازگار حالات کے سبب وہ پٹنہ چلے آئے۔ یہاں محمڈن اینگلو عربک اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی۔ ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ کچھ دنوں تعلیمی سلسلہ منقطع رہا۔ ۱۹۸۶ء میں انہوں نے اردو سے ایم اے کیا اور ۲۰۰۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں اردو میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر ڈاکٹر احمد یوسف بن گئے۔

احمد یوسف کی افسانہ نگاری کا آغاز ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء عیسوی میں ہوا۔ ان کے دو ابتدائی افسانے ''سرخ پان'' اور ''جنتا راج'' دستیاب نہیں ہو سکے۔ اس کے بعد کا افسانہ ''پکا ارادہ'' گیا کے ایک رسالہ ''نئی راہ'' میں شائع ہوا اور پھر ۱۹۴۹ء میں ان کا افسانہ ''وہ بیس کاریگر'' کے عنوان سے پٹنہ کے ہفت روزہ ''انسان کی آواز'' میں شائع ہو کر بہت مشہور اور مقبول ہوا۔

احمد یوسف کے افسانے آزادی کے دور کے فسادات اور ہجرت کے کرب سے عبارت ہیں۔ وہ ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم یک جہتی کے علمبردار تھے۔ ملک کی تقسیم سے دلوں کی تقسیم کو دیکھ کر ان کی روح تک زخمی ہو گئی اور وہ اس درد و کرب میں تڑپتے رہے۔ ان کا افسانہ ''بڑے گپتا اور چھوٹے گپتا'' ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ تہذیب کی روح کو اجاگر کرتے ہیں۔ افسانہ ''خواب گر، خواب شکن'' میں ہندستان کے ''کثرت میں وحدت'' کے نظریے کی خوشبو ملتی ہے۔ افسانہ ''لالٹین'' میں پرانی قدروں اور تہذیبی زوال کا درد ہے۔ احمد یوسف کے افسانے اپنے دور کے ماحول اور تہذیبی و اخلاقی اقدار کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں جو عصری حسیت ہے وہ ہمیں زندگی کی سچائیوں سے روبرو کراتی ہے۔ احمد یوسف کے افسانوں میں زبان، سادہ، دلکش اور پر اثر ہے۔ اسلوب میں داستانی رنگ اور رمزیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انہوں نے جدیدیت کے زیر اثر علامتی، تجریدی اور تمثیلی افسانے بھی لکھے۔ لیکن ان کے کلاسیکی افسانے ہی ان کی ادبی بقا کے ضامن ہیں۔

احمد یوسف نے افسانہ نگاری کے علاوہ خاکہ نویس اور رپورتاژ نگاری میں بھی اپنی انفرادیت قائم کی۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ''دل کے قریں رہتے ہیں'' اور شعری و ادبی محفلوں کی روداد بعنوان ''محفل محفل'' معروف اور مقبول نگارشات ہیں۔ بہاری الفاظ پر مشتمل ''بہار اردو لغت'' ان کا ایک منفرد کارنامہ ہے، جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔

یہ فرد نامہ ڈاکٹر آصف سلیم نے لکھا ہے۔ وہ اردو ادب کے ایک باشعور اور سنجیدہ قاری و معتبر ادیب ہیں۔ جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو مکمل اور گہرے مطالعے کے بعد ہی اپنی تحریر سپردِ قلم کرتے ہیں۔ ان کے درجنوں ادبی اور معلوماتی مضامین ملک کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ احمد یوسف سے ان کے گہرے اور گھریلو رشتے رہے۔ وہ انہیں بے حد عزیز رکھتے تھے اور ادبی معاملات میں تبادلہ خیال بھی کرتے تھے۔ احمد یوسف کے افسانوں اور ان کے فن پر ڈاکٹر سلیم نے ایک کتاب بعنوان ''احمد یوسف کے افسانے، فکر سے فن تک'' بھی تصنیف کی ہے۔ لہٰذا احمد یوسف پر ان کا تحریر کردہ یہ فرد نامہ سند اعتبار کا حامل سمجھا جائے گا۔

—اسلم جاوداں

प्रकाशक

उर्दू निदेशालय

मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

احمد یوسف

ڈاکٹر آصف سلیم

طابع وناشر:

اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر-۲۲

Ahmad Yusuf

By

Dr. Asif Saleem

نام کتاب	:	احمد یوسف
مصنف	:	ڈاکٹر آصف سلیم
سال اشاعت	:	2022ء
کل صفحات	:	128
کمپوزنگ وتزئین	:	محمد سعید احمد
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ-٦

ملنے کا پتہ:

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ-۸۰۰۰۰۱

فون نمبر: 0612-2530093، ای میل: directorurdu@gmail.com

فہرست

- پیش لفظ — احمد محمود — 5
- ابتدائیہ — ڈاکٹر آصف سلیم — 7
- احمد یوسف : ایک نظر میں — 11
- **احمد یوسف : شخصی تعارف :**
  - پیش احوال : چند اہم توجہ طلب پہلو — 16
  - احوال و آثار — 21
- **افسانوی مجموعوں کا تعارف :**
  - افسانوی مجموعہ 'روشنائی کی کشتیاں' — 35
    تلوار کا موسم (افسانہ) — 38
  - افسانوی مجموعہ 'آگ کے ہمسائے' — 44
    چراغ کشتہ (افسانہ) — 48
  - افسانوی مجموعہ '۲۳ گھنٹے کا شہر' — 53
    صورت ایک بے کیفی کی (افسانہ) — 56

  - افسانوی مجموعہ 'رزم ہو یا بزم ہو' — 60
    ہوا یہ کہ ایک دن (افسانہ) — 63
- **احمد یوسف کی رپورتاژ نگاری :**
  - تعارف : محفل محفل — 69
    غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں (رپورتاژ) — 73
- **احمد یوسف کی خاکہ نگاری :**
  - تعارف : دل کے قریں رہتے ہیں — 79
  - قصہ گو تھا فسوں طراز بھی تھا (خاکہ) — 87
- **احمد یوسف کی ناولٹ نگاری :**
  - 'جلتا ہوا جنگل' — 106
- **دیگر کتابیں:**
  - بہار اردو لغت — 114
  - وہ جناح جنہیں میں جانتا ہوں — 118
  - مبارک عظیم آبادی — 121
- **اجمالی جائزہ** — 125
- **کتابیات** — 129

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری و ادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعر و ادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، شوقؔ نیموی، فضلِ حق آزاد، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجزؔ، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری و ادبی عظمت و اہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری و ادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعر و ادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں دس مشاہیر ادب بہار ۱۔ شادؔ عظیم آبادی، ۲۔ پرویزؔ شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہیؔ، ۵۔ علامہ واقفؔ عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمزؔ عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجزؔ کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا نیز مزید مشاہیر دبستان بہار پر فردنامے کی اشاعت کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ نے دانشوران شعر و ادب کی ایک اہم مشاورتی نشست میں مشوروں کے

بعد اتفاق رائے سے مزید ۳۲ فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا۔ جن گراں قدر ادبی شخصیتوں پر فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امداد امام اثرؔ، ۲۔ فضل حق آزاد عظیم آبادی، ۳۔ شوقؔ نیموی، ۴۔ انجم مانپوری، ۵۔ یاس یگانہ چنگیزی، ۶۔ بیدل عظیم آبادی، ۷۔ قاضی عبدالودود، ۸۔ جمیل مظہری، ۹۔ اختر اورینوی، ۱۰۔ سہیل عظیم آبادی، ۱۱۔ شکیلہ اختر، ۱۲۔ حسن نعیم، ۱۳۔ غیاث احمد گدی، ۱۴۔ کلام حیدری، ۱۵۔ احمد یوسف، ۱۶۔ صدیق مجیبی، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ اویس احمد دوراںؔ، ۱۹۔ لطف الرحمٰن، ۲۰۔ اسرار جامعی، ۲۱۔ جمیلہ خدابخش، ۲۲۔ رشیدۃ النساء، ۲۳۔ بیتاب صدیقی، ۲۴۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۵۔ راسخؔ عظیم آبادی، ۲۶۔ عبدالغفور شہباز، ۲۷۔ پیغام آفاقی، ۲۸۔ غلام سرور، ۲۹۔ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ۳۰۔ مظہر امام، ۳۱۔ اجتبیٰ رضوی، ۳۲۔ کیفؔ عظیم آبادی۔

احمد یوسف کا شمار اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے آزادی کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کا پیغام مضمر ہے۔ ''بہار اردو لغت'' کے نام سے ان کی ڈکشنری بھی اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے بڑی خاموشی سے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔

اس فردنامے کے مصنف ڈاکٹر آصف سلیم ایک کہنہ مشق ادیب، تنقید نگار اور محقق ہیں۔ ان کی خوش بختی ہے کہ احمد یوسف ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ادبی معاملوں میں ان سے تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ گھریلو تعلق ہونے کے سبب ان کی شخصیت ان کے سامنے کھلی کتاب تھی۔ لہٰذا یہ فردنامہ سند اعتبار کا حامل ہے۔ اسے اردو ڈائرکٹوریٹ کی ایک کامیاب پیش کش کیا جا سکتا ہے۔

احمد محمود
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

احمد یوسف سے اپنی رفاقت کوئی دو دہائیوں سے زائد کی رہی۔ وہ مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے، شاید کوئی بیٹا گر انھیں ہوتا تو عین اسی کی طرح۔ اس طویل عرصے میں ان کی ذات سے متعلق میرا مشاہدہ یہ رہا کہ وہ دل کی بستی کے مالداروں میں سے تھے۔ یہی سبب ہے کہ زندگی میں بے تکی سی کسی آرزو کا خیال، چاند چھونے کی تمنا میں وسیلے کی خاطر کوئی اضطراب یا دنیاوی منفعت کے لئے کسی قسم کی حرص و ہوس سے ان کا کبھی کا ناطہ نہیں رہا۔ اس راہ میں دیکھا جائے تو احمد یوسف کے تعلق سے محبت کی دو منزلیں بہت واضح رہیں جن میں ان کے یہاں رشتوں کے پاس ولحاظ کے عمل کو میں پہلے مقام پر رکھتا ہوں تو اپنے فن سے ان کی محبت کے عالم کو دوسرے مقام پر دیکھتا ہوں۔

رشتوں کے نباہ کے سلسلے میں ان کے حوالے سے چلئے تو ان کے ساتھ میرا اپنا قصہ یہ ہے کہ جب کبھی کسی سبب سے ان سے رابطے میں کچھ وقفہ ہو جاتا تو ایک روز خود انھیں کا فون آجاتا جس میں اور باتوں کے ساتھ بطورِ خاص میرے لئے یہ ہدایت ہوتی کہ 'اپنی خیریت بتا دیا کیجئے'۔ یہی نہیں انھوں نے میری شادی میں شرکت کے لئے پٹنہ سے سہسرام تک کا سفر بھی کیا تھا۔ دوستوں پہ آیئے تو دھنباد میں غیاث احمد گدی پہ منعقد ایک سمینار میں میرے ہمراہ اس چاہ میں گئے کہ وہاں سے کچھ دور جھریا کے قبرستان میں ان کا وہ دوست آسودۂ خواب تھا اور جس کے مزار پر اصلاً حاضری انہیں مقصود تھی۔

احمد یوسف کے رشتوں کی طویل داستان 'دل کے قریں رہتے ہیں' کے خاکوں میں بہ اندازِ دلچسپ موجود ہے جو ان کے رابطے کی شخصیتوں سے چل کر ان کے والدِ ماجد پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

اسی طرح ان کی بنیادی شناخت یعنی افسانے پہ آیئے تو ان کے اکثر ہا افسانوں میں اپنی مٹی سے گہری وابستگی کی ضمن میں سماجی رابطے کے تعلق سے ان کی ہمہ دم کی فعالیت اور انسان انسان کے مابین الفت ومحبت کی نمود کی کاوشیں ہمیں متاثر کئے بغیر نہیں رہتیں۔

میرے خیال میں احمد یوسف اس طور پر نا آسودہ اس جہاں سے رخصت ہوئے کہ ان کی حیات میں بزمِ اعتراف کی جانب سے انھیں محض اعزاز دیئے جانے اور بہار اردو اکادمی کے نائب صدر بنائے جانے کے علاوہ ان پر کوئی پروگرام نہ ہو سکا جبکہ ان کے ہمعصر وہاب اشرفی تو اس لحاظ سے آسودہ گئے کہ ان کی حیات میں ان پر باضابطہ ایک بڑے پروگرام کا انعقاد ہوا۔

۲۰۰۸ء احمد یوسف کے سلسلے میں ناقابلِ فراموش سال رہا۔ وہ یوں کہ اس سال جہاں انھوں نے اس دارِ فانی سے رخصت لی وہیں اسی برس ان کے ادبی سلسلے کا آخری کارنامہ 'جلتا ہوا جنگل' اشاعت پذیر ہو کر منظر عام پر آیا تھا۔ اس کی چند کاپیاں ہی انھوں نے اپنے دستِ مبارک سے مع اپنی تحریروں کے لوگوں کو ارسال کی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ بیماری کے سبب اسپتال میں داخل کئے جانے کے چند روز قبل ان کے گھر پر میری حاضری ہوئی تھی اور انھوں نے میرے نام کی کاپی میرے حوالے کرتے ہوئے دبے لفظوں میں یہ آرزو کی تھی کہ 'جلتا ہوا جنگل پہ گفتگو ہونی چاہئے'۔

احمد یوسف کی وفات کے بعد چہلم کے موقع سے ان کے ہاں موجود خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے اس عہد کے ڈائرکٹر امتیاز احمد سے ان کی اس آرزو کا میں نے ذکر بھی کیا تھا۔ مگر بات آئی گئی ہو گئی اور فن کار کی وہ آرزو تشنہ رہی۔

ادب میں آج کیمپ اور خیموں کا زمانہ ہے یہاں بلاغرض کوئی کسی کی خبر گیری نہیں کرتا۔ دنیا سے حق کے طرفدار رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ مگر میں اپنے طور پر اپنے سینے پر ایک بوجھ لئے چل رہا تھا کہ کوئی ایک صورت کاش خدا ایسی پیدا کر دیتا کہ ان کی تحریروں کی آراستگی کے حوالے سے میری بھی ایک حاضری یقینی ہو جاتی۔

ایسے میں شکر خدا کا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کی جانب سے احمد یوسف کے فردنامے کی تیاری کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔ میں تہہ دل سے محکمہ کا ممنون ومشکور ہوں۔

احمد یوسف فکشن کے تعلق سے مشہور ومعروف ہوئے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ جہاں افسانہ میں احمد یوسف کے مقام ومرتبہ کا اس طور پر بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عہد میں

بہار سے اردو افسانہ نگاروں کی ایک تثلیث قرار پائی تھی جس کے غیاث احمد گدی، کلام حیدری اور احمد یوسف اہم ستون تھے مگر اس کے علاوہ ان کی تحریروں کے اور بھی میدان رہے۔ مثلاً ان کی رپورتاژ نگاری کا ایسا دلکش اسلوب اُردو دنیا کے سامنے آیا جس کی ماقبل میں کوئی نظیر نہیں ملتی بلکہ متفقہ طور پر تو یہ بات بھی کہی گئی کہ اردو میں رپورتاژ نگاری کو باضابطہ ایک صنف کی حیثیت احمد یوسف کی دین ہے۔ ان کے خاکوں پہ آیئے تو بیان ایسا کہ دورانِ مطالعہ وہاں شامل نہ ہو کر بھی آپ پر اپنی شمولیت کا گمان غالب آجائے۔ ناولٹ کے مجموعہ 'جلتا ہوا جنگل' میں دو۲ قصّے ایسے ہیں جنہیں اس شہرِ عظیم آباد کے گزرے ہوئے دنوں کے مقامی احوال سے جوڑ کر دیکھا جا سکتا ہے جبکہ تیسرے قصے کا لب ولباب یہ ہے کہ وہاں ایک دوسرے کے مابین بے خبری کے عالم کے علاوہ مسائل کے تئیں بطورِ مجموعی غور وفکر نہ کرنے کی صورت میں حالات کی ابتری جھیلنے کے راست اظہار سے ہماری آشنائی ہوتی ہے۔

احمد یوسف کی بلاواسطہ ان تحریروں کے علاوہ ان کی مزید کتابوں میں 'بہار اردو لغت'، 'ڈاکٹر سچدانند سنہا کی انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ 'وہ جناح جنہیں میں جانتا ہوں' اور ان کی ترتیب شدہ کتاب 'مبارک عظیم آبادی' وغیرہ ہیں جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ اور بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

میں نے احمد یوسف پہ مبنی اس فردنامہ میں نہ صرف یہ کہ ان کی کُل شائع شدہ کتابوں کا تعارف پیش کیا ہے بلکہ ساتھ اس کے بطور نمونہ متعلقہ چند صفحات کی شمولیت کو بھی ضروری خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو دیئے گئے اعزازات سے باخبر کرانا بھی چونکہ مجھے لازم تھا سو میں نے یہاں اس کی نشاندہی کا بطور خاص خیال رکھا ہے۔

احمد یوسف کے چاروں افسانوی مجموعوں کے غیر شامل شدہ سولہ افسانوں سے متعلق اطلاعات، ان کے فن پر اظہار خیال کرنے والے ناقدین کے نام نامی کے اندراجات کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں سے تفویض کی گئی ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگریوں، رسائل کے گوشوں اور ان کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی کلمات ارسال کرنے والوں کے اسمائے گرامی کی بابت آگاہ کرتے ہوئے ان کی وفات کے کوئی گیارہ برسوں بعد ۲۰۱۹ء کے ماہ اکتوبر و نومبر میں اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے ساتھ پٹنہ دوردرشن

کی جانب سے منعقد کئے گئے خصوصی پروگرام کا ذکر بھی یہاں ناگزیر تھا۔ لہٰذا اسے بھی احاطۂ تحریر میں لینے کی سعی کی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ احمد یوسف پر یہ فردنامہ ان کی گرانقدر شخصیت، ان کے خاندانی احوال اور ان کے علمی وادبی کارناموں سے گزرتا ہوا ۲۰۰۸ء میں ان کی وفات کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے مگر اچھے اور سچے فن کار کے سلسلے میں واقعہ یہ ہے کہ اُسے کبھی موت نہیں آتی اور وہ اپنے کمالات کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

میں ممنوں ہوں اُردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے ڈائرکٹر جناب احمد محمود کے ساتھ ان کے فعال معاون ڈاکٹر اسلم جاوداں کا کہ انھوں نے احمد یوسف پر فردنامہ تحریر کرنے کے لئے میرے نام کا انتخاب کیا۔

میں ممنون ہوں اللہ کی دی ہوئی مہلتِ حیات کا کہ اس نے محترمہ شمیم یوسف (اہلیہ احمد یوسف) کو ہمارے درمیان سلامت رکھا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ وہ اپنے سرتاج یعنی احمد یوسف پہ مبنی میرے تحریر کردہ اس فردنامہ کو دیکھ سکیں گی۔

آخر میں بطور خاص میں اپنے دوست ڈاکٹر نسیم اختر کا بھی ممنون ہوں کہ جب جب ضرورت آن پڑی اپنے گرانقدر مشوروں کے ساتھ مجھے وہ تیار ملے۔

فنا کے بعد بھی اہل کمال زندہ ہیں

ڈاکٹر آصف سلیم

احمد یوسف: ایک نظر میں

نام: سید عثمان یوسف

قلمی نام: پہلے ع۔ یوسف ('نئی راہ' رسالہ میں شائع ہوئے دو افسانوں میں یہی نام ہے) بعدۂ احمد یوسف (تاوقت آخر)

والد: سید محمد یوسف، پٹنہ یونیورسٹی سے 'لاء' (Law) کے پہلے بیچ میں ۱۹۲۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔

والدہ: نعیمہ خاتون

دادا: حاجی سید عبداللطیف، زمیندار

پیدائش: ۱۰رجنوری ۱۹۳۰ء

جائے پیدائش: صدر گلی، پٹنہ سیٹی

- **ابتدائی تعلیم:** مدرسہ عالیہ، کلکتہ، پانچویں جماعت تک۔
محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ میں ساتویں جماعت میں داخلہ ۱۹۳۹ء۔
محمڈن اینگلو عربک اسکول سے ۱۹۴۴ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔
آئی۔ ایس سی و بی۔ ایس سی تک کی تعلیم علی گڑھ میں ۱۹۴۹ء۔
اردو میں ایم کرنے کی غرض سے ۱۹۸۰ء میں ادیب کامل کا امتحان پاس کیا۔
ایم۔ اے (اردو) کا امتحان ۱۹۸۶ء میں مگدھ یونیورسٹی سے پاس کیا۔
پی ایچ۔ ڈی، پٹنہ یونیورسٹی، ۲۰۰۰ء۔
مقالے کا موضوع تھا، 'اردو ناول نگاری کے کرداروں کا سماجی پس منظر'۔
- **معاشی ذرائع:** بیس برسوں تک سائیکل کا بزنس، دو سال تک دلّی میں ایک کمپنی کھول کر کچھ ایکسپورٹ کرنے کی کوشش کے بعد ۱۹۷۶ء میں پٹنہ آکر ایک پلاسٹک کا کارخانہ کھولا۔ پھر ۱۹۸۴ء میں خدابخش لائبریری، پٹنہ سے مختلف پروجکٹوں پر کام کرنے کے سلسلے میں وابستہ ہوئے۔
- **شریک حیات:** کانپور، اتر پردیش کے سید مشتاق حسین فاروقی کی صاحبزادی شمیم فاطمہ سے رشتۂ ازدواج میں بندھے جو بعد میں شمیم یوسف کہلائیں۔
- **قیام:** صدر گلی، پٹنہ سیٹی۔
- **لکھنے کی شروعات:** اپنے استاد رشید احمد صدیقی سے متاثر ہو کر علی گڑھ سے۔
افسانہ نگاری کا آغاز: ۱۹۴۸ء میں۔ پہلا افسانہ رسالہ 'نئی راہ' گیا میں بعنوان 'پکا ارادہ' شائع ہوا۔ پھر ۱۹۴۹ء میں ان کا ایک افسانہ 'بیس کاریگر' ہفت روزہ 'انسانی آواز' میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ ان کے بہت مقبول افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔

- **انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی:** احمد یوسف نہ صرف یہ کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن رہے بلکہ ۱۹۴۸ء میں تو انھوں نے اس کی از سرِ نو تشکیل بھی کی تھی۔
- **افسانوی مجموعے:** 'روشنائی کی کشتیاں' ۱۹۷۶ء، کلچرل اکیڈمی، گیا
  'آگ کے ہم سائے' ۱۹۸۰ء، پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ
  '۲۳ گھنٹے کا شہر' ۱۹۸۴ء، پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ
  'رزم ہو یا بزم ہو' ۲۰۰۴ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
- **رپورتاژ:** 'محفل محفل' (۹ رپورتاژ کا مجموعہ) ۱۹۸۹ء، پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ
- **خاکے:** 'دل کے قریں رہتے ہیں' (۱۳ خاکوں کا مجموعہ)، ۲۰۰۷ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
- **ناولٹ:** 'جلتا ہوا جنگل' (تین ناولٹ کا مجموعہ)، ۲۰۰۸ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
- **دیگر کتابیں:** 'بہار اردو لغت' (تقریباً تین ہزار الفاظ ومحاورات پر مبنی)، ۱۹۹۵ء، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔
  'وہ جناح جنہیں میں جانتا ہوں' (ڈاکٹر سچیدانند سنہا کی کتاب کا انگریزی سے اردو ترجمہ)، ۱۹۹۶ء خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔
  مبارک عظیم آبادی، ۲۰۰۶ء، بہار اردو اکادمی، پٹنہ
- مضامین تبصرے وتجزیے: باضابطہ کوئی کتاب نہیں مگر جابجا اس نوع کی تحریریں ملتی ہیں۔

- **احمد یوسف کے چاروں مجموعہ سے الگ سولہ افسانے:** 'مارا دیارِ غیر میں'، 'گھن'، 'تھکے ماندے'، 'گئی یہ عمر عزیز'، 'مسافر'، 'بس یہی کچھ لوگ اب'، 'درویش خدامت'، 'یہاں زینے ہی زینے ہیں'، 'بکھراں رات کے سناٹے'، 'دیدنی ہے شکستگی دل کی'، 'زینہ بہ زینہ'، 'صبح کا سفیر'، 'افسانہ بنے'، 'سمتیں اور سمتیں'، 'قطرہ بہ سطح بحر'، یادیں امنڈتی ہوئی۔
  (بحوالہ: احمد یوسف کا افسانوی سفر/ ڈاکٹر سید عرفان ضیاء یوسف)
- **احمد یوسف کے فن پر ناقدین کا اظہار خیال کیا:** وہاب اشرفی، مہدی جعفر، محمد حسن، قمر رئیس، قدوس جاوید، عظیم الشان صدیقی، بشر نواز، عتیق احمد، مناظر عاشق ہرگانوی، طارق چھتاری، ارتضیٰ کریم، محمود عالم، احمد حسین آزاد، تقی رحیم اور ڈاکٹر نسیم اختر۔
- **احمد یوسف کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی کلمات:** پروفیسر وہاب اشرفی، شفیع جاوید، شوکت حیات، عبدالصمد، شفیع مشہدی، ذکیہ مشہدی، شمشاد حسین، ممتاز احمد خاں، مشتاق احمد نوری، قاسم خورشید، خورشید اکبر، شکیب ایاز، مظفر بلخی، شہزاد منظر، ہمایوں اشرف، علمی وادبی تنظیم پٹنہ، اور حسن احمد، پٹنہ

(بحوالہ: احمد یوسف کا افسانوی سفر/ ڈاکٹر سید عرفان ضیاء یوسف)

- **احمد یوسف پر مختلف یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D) کی ڈگری تفویض:**
  (۱) موضوع۔ 'احمد یوسف کے افسانے: تجزیاتی مطالعہ'
  اسکالر: سید آصف حسین المعروف بہ آصف سلیم
  نگراں: پروفیسر انیس فاطمہ فاروقی، پٹنہ یونیورسٹی، ۱۹۹۸ء
  (۲) موضوع۔ 'احمد یوسف: شخصیت اور افسانوی فن کاری'
  اسکالر: اطہر حسین انصاری
  نگراں: ڈاکٹر شائستہ انجم نوری، مگدھ یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء
  (۳) موضوع۔ 'جدید اردو افسانہ نگاری اور احمد یوسف'
  اسکالر: محمد عبدالرحمٰن ارشد
  نگراں: ڈاکٹر ابوبکر عباد، دہلی یونیورسٹی، ۲۰۱۸ء

- **اعزازات:** (۱) بزمِ اعتراف کی جانب سے توصیفی سند اور ایوارڈ سے سرفراز۔
  (۲) بہار اردو اکادمی کے نائب صدر بنائے گئے۔
- **احمد یوسف کے فن و شخصیت پر رسائل کے گوشے:** (۱) سہ ماہی رسالہ 'روشنی' کراچی کا خصوصی شمارہ۔۲۰، صفحہ ۱۹۵ تا ۲۶۳، ۲۰۰۵ء
  (۲) ماہنامہ زبان و ادب (خصوصی اشاعت بیادِ احمد یوسف)، پٹنہ جلد: ۳۰، شمارہ: ۱۔۲۔۳، جنوری۔فروری۔مارچ، ۲۰۰۹ء
- **وفات:** ۱۷/جون ۲۰۰۸ء
- **تدفین:** آبائی قبرستان، پٹنہ سیٹی
- **بعد وفات احمد یوسف پر پروگرام:** (۱) ۳۰/اکتوبر ۲۰۱۹ء کو اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے زیر اہتمام ابھیلیکھ بھون، بیلی روڈ، پٹنہ میں احمد یوسف یادگاری تقریب کا انعقاد۔
  (۲) ۲۷/نومبر ۲۰۱۹ء کو پٹنہ دوردرشن پر احمد یوسف: فن اور شخصیت کے موضوع پر خصوصی پروگرام کا انعقاد۔

❋

احمد یوسف: شخصی تعارف

پیش احوال۔ چند اہم توجہ طلب پہلو :

صوبہ بہار کے شہر عظیم آباد (پٹنہ) کے اعلیٰ و ارفع سادات خاندان سے تعلق رکھنے والے اردو فکشن کے نامور ادیب جناب احمد یوسف کئی اعتبار سے بلا کے دھنی تھے۔ جس میں پہلے اندراج کے تحت میں ان کی اخلاق مندی کو مقام دیتا ہوں۔ یہ ان کی وہ مقبولِ زمانہ روش تھی جو سماج کے پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ ناخواندگان کے ایک بڑے طبقے کے درمیان بھی انہیں محترم و ممتاز حیثیت سے سرفراز کرتی ہے۔

ہنس کے ملنا، جھک کے ملنا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کے ملنا ان کی شخصیت کا وصفِ خاص تھا۔ وہ تاحیات مزاج کے یک رخے انداز و اطوار پر کاربند رہے۔ اپنی ذاتی رفاقت کے تقریباً دو دہائیوں پہ محیط اوقات میں عموماً وہ مجھے جس قدر نارمل اور پرسکون نظر آئے، بھری آزمائش کی گھڑی میں اپنے اکلوتے بڑے بھائی سید سلطان یوسف کے جنازہ کے ہجوم میں میری انگلی تھامے قبرستان کو بڑھتے ہوئے بھی ان کے چہرے پر کم و بیش وہی عالم مع کچھ اضافی غم کے غالب رہا۔ ان سے متعلق میرا مشاہدہ یہ رہا کہ اپنے غم کو عام کرنے یا عیاں کرنے کے کبھی وہ قائل نہ رہے۔ وہ غم کے ساتھ الجھن و پریشانی کے صبر آزما حالات سے مقابلہ آرائی کے لئے محض خود کو آمادہ رکھتے۔ ورنہ دنیا کے لئے اپنے رُخِ دلکش و پُرنور پر آویزاں گلاب جیسے ہونٹوں پہ وہی سدا بہار سی مسکراہٹ کا اہتمام رکھنا اور دنیا کی نگاہوں سے اپنے غم کو صاف چھپا جانا ان کی دسترس کمال کا حصہ تھا۔

احمد یوسف کی حیاتِ عزیز میں اب اس سے بڑا غم اور کیا ہوگا کہ وہ دنیا کی ہزار آسودگیوں کے عالم میں بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سے محروم رہے۔ وہ بے ثمری کے شکار رہے مگر اس غم کو کبھی کسی پہ شکوے کی صورت عام نہ کیا۔ بلکہ اس ضمن میں ان کی کشادہ دلی کا میں خود یوں گواہ بنا کہ انھوں نے براہِ

راست ایک موقع سے میرا شادی کے سلسلے میں خیال دریافت کیا تھا جس پر میں بے حد متحیر ہوا تھا کہ ان کے دولت کدہ پر آمد و رفت کے دوران کبھی کوئی شادی کی سِن والی لڑکی میری نگاہوں سے نہیں گزری تھی۔ احمد یوسف جینوین افسانہ نگار تھے وہ کردار وضع کرتے تھے اور ان کی نفسیات کے تہہ بہ تہہ زینے طئے کرنے کے ہنر سے واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے مجھ پر متعلقہ مطلع صاف کرتے ہوئے اس روز مجھ سے کہا تھا کہ ُبھئی میری بہت سی بیٹیاں ہیں جن کی شادیوں کا مجھے خیال رہتا ہے‘۔

ہاں ایک بڑے اور بلند نگہہ افسانہ نگار کی حیثیت کے شایانِ شان انھوں نے اپنے اس نجی غم کو خوابوں کی دنیا کے توسط سے پیراہنِ افسانہ ضرور عطا کیا ہے۔ اپنے افسانہ ''دبے پاؤں'' میں بڑے حُسن کے ساتھ وہ ایک بچی کو اپنے خیالوں میں وضع کرتے ہیں اور اس کا نام خدیجہ رکھتے ہیں۔ وہ اسے کِٹ کِٹ کہہ کر پکارتے ہیں۔ بتدریج بچی کا قد بڑھتا ہے اور جب وہ چلنے لگتی ہے تو اُسے اسکول بھیجا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کالج جانے لگتی ہے تو ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر بھی ستانے لگتی ہے۔ اس مسئلہ پر یہ درست ہے کہ بالخصوص بچی کے سلسلے میں اس کی ماں پر تردد کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ یہ کہتی بھی دکھائی دیتی ہے کہ آپ جیسی بےفکری خدا سب کو نصیب کرے۔ لیکن یہ ساری کاوش اور سارے خیال کی ٹریجڈی ہے کہ یہ محض تیز ہوا کے دوش پر آتے ہیں اور بس۔ احمد یوسف کا یہ افسانہ ان کی طرح اولاد سے محروم ان تمام جوڑوں سے متعلق ایک نمائندہ افسانہ ہے جو اپنے گھروں میں چھوٹے چھوٹے ننھے ننھے قدموں کی چاپ سننے کو ہمیشہ ترستے رہتے ہیں اور اپنی خیالی دنیا میں واہمہ کے سہارے تمام عمر بسر کردیتے ہیں۔

افسانہ نگار کی حیثیت سے احمد یوسف کے سلسلے میں اہلِ نقد و نظر انہیں اپنی سطح سے جو بھی مقام عطا کریں وہ اپنی جگہ مگر دور دور کے سچ مچ کے انہیں جاننے والے بطورِ خاص گہری اخلاق مندی کے ایک نہایت محبوب پیکر کی حیثیت انہیں عطا کرنے میں کہیں سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے۔ مشہور افسانہ نگار اور ایک عہد میں بہار اردو اکادمی سکریٹری رہے مشتاق احمد نوری نے تو میری نظامت میں ۲۷/نومبر ۲۰۱۹ء کو احمد یوسف کی شخصیت اور فن پر دوردرشن کے ایک مذاکرے کے دوران ان کی اخلاق مندی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک دلچسپ قصّہ یوں سنایا تھا کہ میں دفتر کے کام سے نکلا ہوا تھا، کھانے کا وقت ہو چکا تھا، میری واپسی وقت طلب تھی اور احمد یوسف لنچ پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان دنوں وہ اکیڈمی کے وائس چیئر

مین تھے۔ نوری صاحب کی بات میں مبالغہ نہیں تھا کیونکہ اپنی اور ان کی خدابخش لائبریری کی فیلوشپ کے دنوں میں کینٹین میں میرے لئے بھی ان کا یہی یکساں عمل ہوا کرتا تھا۔ ان کی اخلاق مندی کی یہ محض سرسری سی مگر بڑی اہم سی ایک مثال ہے۔

اردو کے معروف فکشن نگار جناب عبدالصمد نے بھی مورخہ ۳۰/اکتوبر ۲۰۱۹ء کو اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے زیر اہتمام، اَبھیلیکھ بھون، بیلی روڈ، پٹنہ میں منعقد احمد یوسف یادگاری تقریب میں احمد یوسف کی اخلاق مندی کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب پٹنہ میں لکچرار کے عہدے پر میری بحالی ہو چکی تھی اور میں طبیعت کے ناساز ہونے کے سبب اپنے وطن بہار شریف میں تھا۔ احمد یوسف نے فون پر میری خیریت دریافت کی تھی اور جب انہیں اس کا علم ہوا تو دوسرے ہی دن وہ میری عیادت کو بہار شریف چلے آئے تھے۔

احمد یوسف کا ۲۰۰۸ء میں انتقال ہوا۔ گویا انہیں گزرے ایک یگ بیت گیا مگر اب بھی جب سردیوں کے موسم آتے ہیں تو ان کی بڑی یاد آتی ہے۔ وہ دسمبر کے اواخر سے ہی اپنے رابطے کے ادیبوں اور شاعروں کو پٹنہ سیٹی واقع نون کے چوراہے کی نہاری کی یاد دلاتے مگر پروگرام کے طئے تمام ہوتے جنوری کا مہینہ آجاتا۔ صبح سات بجے پٹنہ سیٹی کی صدر گلی جانا کارِ دشوار سے کم نہ ہوتا مگر ان کی اُلفت میں ان کے چاہنے والے وہاں پہنچتے ضرور۔ دو دو چار چار کی تعداد میں وقفے وقفے سے وہ مختلف لوگوں کو پوچھا کرتے تھے۔ مشتاق احمد نوری، علی امام اور شوکت حیات کو تو ایک دفعہ خود میں نے دیکھا تھا۔ احمد یوسف کی گزرے دنوں کی وہ ضیافت سردیوں کے موسم سے نسبت خاص رکھتی ہے جہاں وہ خود بڑھ بڑھ کر آنے والوں سے اصرار کرتے اور تندور سے نکلتی ہوئی گرم روٹیوں کے ساتھ پیالہ پیالہ نہاری سے انہیں شکم سیر کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔

احمد یوسف نے اپنی اس اخلاق مندانہ روش پر ایک نہایت دلچسپ افسانہ ’حسن پورسے‘ تحریر کیا ہے جہاں تبریز بھائی اور آمنہ باجی ہیں۔ افسانہ میں واقعہ یہ ہے کہ تبریز بھائی کے دو چھوٹے نسبتی بھائی جب ان کے گھر آتے تو تبریز بھائی کھل اُٹھتے۔

تبریز بھائی کے پاس محبت کا اتھاہ سمندر تھا۔ معصومیت و سادہ لوحی کے ساتھ بلا کی فراخدلی تھی۔ چنانچہ وہ ان کی ضیافت میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھتے اور انہیں ایسی چیزیں بھی کھلاتے جو اس دور میں

شہروں تک میں میسر نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ وہ انہیں آلودگیوں سے پاک چھوٹے چھوٹے دیہات میں سیر سپاٹے کے لئے بھی لے جاتے۔

جیسا کہ ہمیں علم ہے کہ احمد یوسف کی انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی وابستگی رہی اور انھوں نے باضابطہ ۱۹۴۸ء میں اس کی از سر نو تشکیل کی تھی۔ حسن نعیم اس کے سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ لہٰذا یہ نظریہ بھی جا بجا ان کے افسانوں پہ غالب نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے ان کا افسانہ 'وہ ایک شخص' اس کی راست نمائندگی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ افسانہ جاگیر دارانہ نظام کے ظالمانہ رویے کی شہباز کے توسط سے عمدہ تصویر کشی کرتا ہے۔ افسانہ میں کردار مست کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ علاقے میں گھوم کر محض اس بات کا عام کیا جانا کہ کھیتوں میں جو گندم ہوتا ہے وہ ہمارے حصے میں کیوں نہیں آتا کو جرم قرار دیا جاتا ہے اور اسے تیس سال کے لئے اندھے مقبرے میں قید کر جوتے گانٹھتے ہوئے زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود یہاں افسانہ نگار نے ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ظالم شہباز نے دراصل مست کو ذلیل کرنے کا جو پروگرام بنایا تھا اس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ مست نے اپنے سینے میں جو آگ روشن کی تھی وہ ہر کسان کے سینے میں روشن ہو چکی تھی۔

احمد یوسف کو اپنی حیات عزیز میں کسی قسم کی قلت کا سامنا نہیں تھا۔ پٹنہ سیٹی کے شرفاء میں شمار ہوتا۔ شہرت یافتہ خاندان سے نسبت رہی۔ پُرکھوں کے حویلی نما مکان میں قیام کیا۔ معاشی اعتبار سے کاروبار سے وابستہ رہے۔ جگہ جائداد سے کرائے کی وصولی بھی آمدنی کا وسیلہ رہی۔ خود اپنی صلاحیتوں کے بوتے بھی معاشی خوشحالی کی خاطر فعال و متحرک رہے۔ یہی سبب ہے کہ احمد یوسف نے نہایت پرسکون انداز میں اپنے فن پر ہی محض توجہ مبذول کی۔ انھوں نے بے جا یا وقتی تمناؤں سے جس قدر ہو سکا فاصلہ بنائے رکھا۔

احمد یوسف کی اپنی مٹی کے ساتھ اپنے قرب وجوار کے سماج کے جملہ مسائل و معاملات سے گہری وابستگی رہی جس کے اعتراف میں ایک مقام پر خود انھوں نے تحریر کیا ہے کہ:

''ہم لاکھ آسمان پر پرواز کریں، زمین کی کشش ثقل ہمیں ہر حال میں زمین پر واپس لے آتی ہے۔''

یہی سبب ہے کہ اپنے خاصے افسانوں میں وہ زمینی حقائق سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان

کے یہاں فنی کمال یہ ہے کہ وہ اپنے عصری سماج کے بڑے یا چھوٹے موضوعات کو اپنی تحریری ہنرمندی کے سہارے اہم اور توجہ طلب بنا دینے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ اب یہ ان کا کمال ہی تو ہے کہ اپنے افسانہ 'لالٹین کی روشنی' میں انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ لالٹین کی روشنی ایک پرانی تہذیب کی علامت ہے جو آنے والی نئی تہذیب سے خوفزدہ سی تھی۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے بطورِ خاص اپنے اطراف کے اس سماج کا قصہ رقم کیا ہے جہاں ایک ایسی گنگا جمنی تہذیب تھی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ ہندوؤں کی تقریبات میں مسلمان بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور محرم کے موقع پر ہندو آگے آگے ہوتے۔ اس کے علاوہ افسانہ میں عظیم آباد کی تہذیب کی ایک جھلک پیش کرتے ہوئے جہاں چَیت کے ناچ کا ذکر کیا گیا ہے جس میں تیرہ چودہ سال کے لڑکے لڑکیوں کا روپ دھار کر ناچتے گاتے وہیں ایک مگدھی گیت بھی پیش کیا گیا ہے جس سے ایک طرزِ خاص کی زندگی سے ہمارا براہِ راست تعارف ہو جاتا ہے۔

افسانہ 'نقش ناتمام' میں افسانہ نگار نے ایک دوسرے درجے کے شہر کے سب سے غریب طبقے کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ متذکرہ افسانہ میں سڑک کنارے کے چائے والے ہیں، چھوٹے دوکاندار ہیں، رات کو پہرہ دینے والا نیپالی چوکیدار ہے اور رکشے والوں میں ایک قاسم رکشے والے کا چھوٹا سا خاندان ہے۔ رہنے کے لئے اس کے پاس گھر نہیں ہے۔ کپڑے جسم پر اتنے ہی ہیں کہ بمشکل ستر پوشی ہو پاتی ہے۔ ایسے غربت کے عالم میں مگر اس طبقے کا المیہ یہ ہے کہ اسے تاڑی، جوا اور شراب کی بھی لت ہوتی ہے اور اپنے چھوٹے سے بجٹ میں کٹوتی کر کے وہ اپنے بچوں کے حصے کی رقم کو بھی برباد کر دیتا ہے۔

یہ افسانہ بھی خالصتاً افسانہ نگار کے وطنِ عزیز کا افسانہ ہے کیونکہ اس کے کردار قاسم کو سواری ملنے کے ذیل میں پیر بہوڑ کا ذکر کیا گیا ہے جو اس شہر عظیم آباد میں واقع ہے۔

اسی طرح بعد از مرگ مُردوں کی کفن چوری سے لے کر مُردوں کے اعضاء کی بے حرمتی کرنے والوں کے قابلِ مذمت غیر انسانی رویوں پر 'ورثہ' ان کا ایک فکر انگیز افسانہ ہے۔ ایک زمانے میں ایسے واقعات مختلف مقامات پر رونما ہو رہے تھے۔ خیر و شر کے تصادم کے زیر اثر تحریر کردہ احمد یوسف کا ایک بے حد اہم افسانہ ہے ''بلب ایک گزرگاہ کا''۔ یہاں لوگوں کی پریشانیوں کے پیش نظر ایک اللہ والا اپنی دیوار پر بار بار بلب لگاتا ہے اور سماج دشمن عناصر بار بار اس کی چوری کرتے ہیں۔ یہ عمل چلتا رہتا ہے کہ سماج کو روشنی کی ضرورت ہے۔

الغرض احمد یوسف کے گنجینۂ افسانہ میں موضوعات کی سطح پر بڑی وسعت ہے جہاں وہ متعلقہ موضوع پر مبنی ممکنہ حد تک گہری معنویت سے ہمیں بہرہ مند کرنے کے عمل میں اپنے دلچسپ اسلوب کی بناء پر ایک امتیازی حیثیت کے ساتھ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

احمد یوسف نے حکایتوں کی طرز پر، داستانوں کے رنگ اخذ کر اور نت نئی تکنیک کو بروئے کار لاکر اپنے افسانوں کو بشوق مطالعہ کے قابل بنا دیا ہے۔ اردو میں جدیدیت کے اثرات کو بھی انھوں نے قبول کیا اور علامتی، تجریدی اور تمثیلی افسانے لکھ کر اپنی فعال تحریری وابستگی کا ثبوت پیش کیا۔

احوال وآثار :

(خاندانی پس منظر، افسانہ نگاری کی ابتداء، پہلا افسانہ، عہد طفلی کے
کچھ اہم دلچسپ قصے، پیش رو، معاصرین اور متاخرین افسانہ نگار)

احمد یوسف پٹنہ سیٹی میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کا عطا کردہ نام سید عثمان یوسف تھا۔ اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں کلکتہ مدرسہ میں انھوں نے پانچویں جماعت تک پڑھا۔ احمد یوسف کی والدہ بعد میں پٹنہ چلی آئیں تھیں اور وہ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ کلکتہ ہی میں رہتے تھے جہاں ان لوگوں کا سائیکل کا ایک بہت بڑا کاروبار تھا۔ کاروبار کے بڑے ہونے کا اندازہ اس طور پر بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں ہرکولس سائیکل کے وہ لوگ ہندوستان میں سب سے بڑے امپورٹر تھے اور ان کا مقابلہ براہ راست جانکی داس اینڈ سنز سے تھا جو آج کے زمانے میں اٹلس سائیکل بناتے ہیں۔

مصنف کے دادا پٹنہ میں ایک زمیندار تھے۔ انھوں نے ایک روشن دماغ زمیندار کی طرح زمینداری کو کافی فروغ دیا اور کافی مواضعات خریدے اور بیچے۔

شہر میں کافی جائداد خریدی۔ آدمی بے انتہا باعمل اور فعال تھے اور Time is Gold کے اصول پر ساری زندگی کاربند رہے۔ الغرض وہ دین اور دنیا دونوں کے حامی تھے۔

۱۹۳۹ء سے احمد یوسف کی والدہ مستقل طور پر پٹنہ رہنے لگیں۔ اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو خود اپنی علالت اور دوسرے یہ خیال کہ پٹنہ رہ کر ہی وہ اپنے سسر کی خدمت کر سکتی تھیں کیونکہ ساس کا ۱۹۳۷ء

میں ہی انتقال ہو چکا تھا۔

۱۹۳۹ء میں احمد یوسف کو پٹنہ بلا لیا گیا اور یہیں ان کا داخلہ محمڈن اینگلو عربک اسکول میں ساتویں جماعت میں کرا دیا گیا۔ احمد یوسف کی والدہ کے ماموں نے اسکول میں ان کی پیدائش کا سال ۱۹۳۰ء لکھوایا تھا جو موصوف کا صحیح سن ولادت ہے۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول میں احمد یوسف کا نام سید عثمان یوسف ہی لکھوایا گیا تھا۔

احمد یوسف کے دادا کے سلسلے میں فراہم اطلاع کی رو سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا خاندان حضرت امام باقر سے نسبت رکھتا ہے۔ ان کے دادا کے بزرگوں میں سید محمد برقعہ پوش مدینہ سے نسبت رکھتے تھے۔ ان کے پوتے سید عبدالرحیم مفتی پہلے دہلی میں قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے اور اس کے بعد جونپور کے قاضی مقرر ہوئے۔

ان کے دادا کے جدامجد سید امجد علی کے بھائی سید امان علی کے صاحبزادے سکندر نواز جنگ حافظ سید محمد رضا بھوپال کے مدارالمہام اور حیدرآباد دکن کے جج مقرر ہوئے تھے۔ سید امجد علی کے صاحبزادے سید ماجد علی المعروف بہ حاجی سید محمد شبراتی کے محل اولیٰ سے دو صاحبزادے میر مکّی اور میر مدنی ہوئے۔ میر مکی لاولد تھے جبکہ میر مدنی کے دو بیٹے ہوئے جن میں ایک سید عبدالوہاب تھے اور دوسرے کا نام سید عبدالغفور تھا۔

سید عبدالوہاب کی ایک صاحبزادی بی بی نعیمہ خاتون احمد یوسف کی والدہ تھیں۔ سید ماجد علی کے محل ثانی سے تین صاحبزادے ہوئے۔ حاجی سید عبدالواحد، حاجی سید عبداللطیف اور حاجی سید عبدالمجید۔

حاجی سید عبداللطیف کے تین صاحبزادے ہوئے جن میں حاجی سید محمد یوسف وکیل جناب احمد یوسف کے والد تھے جن کی ادبی حیثیت یہ تھی کہ وہ ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر ملکہ حاصل تھا۔ تاریخ ہائے وفیات اور تہنیتی نظمیں انھوں نے خوب کہیں۔ ان کے اس نوع کے تقریباً تمام کلام کو یکجا کر کے ڈاکٹر نسیم اختر نے مع ضروری حواشی و پروفیسر وہاب اشرفی کے پیش لفظ سے مزین کر 'طرزِ سخن' کے نام سے ۲۰۱۵ء میں منظرِ عام پر لایا ہے۔ ان کے علاوہ حاجی سید محمد ہاشم اور سید علی حبیب احمد یوسف کے منجھلے اور چھوٹے چچا تھے۔

احمد یوسف کے والد کے محل اولیٰ سے نو بچے ہوئے۔ حسن آرا بیگم، سلطانہ آرا بیگم، سید سلطان

یوسف، سید آل احمد (جو ڈھائی برس کی عمر میں ہی وفات پا گئے) اس کے بعد ایک اور صاحبزادے پیدا ہوئے (جو پیدائش کے فوراً بعد ہی فوت ہوگئے)، سید عثمان یوسف، حشمت آرا بیگم، شوکت آرا بیگم، زینت آرا بیگم وغیرہ ایک ماں سے تھے جن کا انتقال غالباً ۱۹۴۱ء میں ہوا۔ اس کے بعد ان کی دوسری والدہ سے ایک بچہ سید نعمان یوسف پیدا ہوا لیکن صرف چھ ماہ کی عمر میں اپنی والدہ کی موت کے دو ماہ بعد ہی فوت ہوگیا۔

یہاں جناب احمد یوسف کی دادی کا ذکر کرنا بھی اس لئے ضروری ہے کہ ان کا براہ راست تعلق مدینہ میں میزبان رسول حضرت ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ ہندوستان میں ان کے مورث اعلیٰ نواب لطف علی خاں صادق فرخ سیر کے عہد میں دلی کے ناظم رہ چکے تھے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد جو حصول سلطنت کے لئے شہزادوں کے درمیان آپسی تنازعہ ہوا تھا اس میں انھوں نے اہم رول ادا کیا تھا اور یوں فرخ سیر نے انہیں ناظم دہلی مقرر کیا تھا اور انہیں ہفت ہزاری کا خطاب بھی دیا تھا۔ ان کے صاحبزادے نواب عنایت خاں راسخ نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے ان کی کئی تصنیفات اعلیٰ ادبی کارنامے کے زمرے میں آتی ہیں۔ اسی خاندان کے ایک صاحب نے تاریخ مظفری لکھی۔ عنایت خاں راسخ کے دو پوتے باقر علی خاں اور جعفر علی خاں ہوئے۔

باقر علی خاں کے خاندان کے کچھ لوگ یہیں رہ گئے اور یہی حال جعفر علی خاں کے خاندان کا بھی ہوا (جو بعد میں شیعہ ہوگئے تھے)۔

جعفر علی خاں کی پوتی عارفہ بیگم شاد کی والدہ تھیں اور باقر علی خاں کی پرپوتی بی بی ولایتی بیگم احمد یوسف کی دادی تھیں (باقر علی خاں عقیدتاً سنّی ہی رہے)۔ انھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام ''تاریخ الانصار'' ہے۔

احمد یوسف نے ۱۹۴۴ء میں محمڈن اینگلو عربک اسکول سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ پھر وہ علی گڑھ چلے گئے جہاں انھوں نے آئی ایس سی میں داخلہ لیا اور بی ایس سی تک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں پٹنہ واپس آ گئے۔

اس کے بعد کئی برسوں تک اپنی کاروباری مصروفیتوں میں وہ کچھ اس طرح الجھے رہے کہ آئندہ کی تعلیم کی جانب انھوں نے دھیان ہی نہیں دیا۔ پھر ۱۹۸۰ء کا زمانہ آیا کہ جب احمد یوسف نے ایک دفعہ پھر تعلیم

کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور اسی سال اردو میں ایم اے کرنے کی غرض سے ادیب کامل کا امتحان دیا اور فرسٹ کلاس میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۸۶ء میں احمد یوسف نے مگدھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ بعدازیں انھوں نے اردو ناول نگاری کے کرداروں کا سماجی پس منظر کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پٹنہ یونیورسٹی میں داخل کیا اور پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔

احمد یوسف نے ۱۹۴۸ء سے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ یوں کہنے کو تو انھوں نے ۱۹۴۶ء سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ تمام تحریریں رشید احمد صدیقی سے اس درجہ متاثر تھیں کہ انھوں نے ان سب کو ضائع کر دیا اور پھر ۱۹۴۸ء سے باضابطہ طور پر انھوں نے افسانہ نگاری شروع کی۔ موصوف کے دو ابتدائی افسانے ''سرخ پان'' اور ''جنتا راج'' ضائع ہوگئے۔ اس کے بعد ان کا ایک افسانہ ''پکا ارادہ'' کے عنوان سے ''نئی راہ'' گیا میں شائع ہوا۔ تقریباً اسی زمانے یعنی ۱۹۴۹ء میں احمد یوسف کا ایک افسانہ ''بیس کاریگر'' کے عنوان سے ہفتہ وار ''انسانی آواز'' پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔

جیسا کہ احمد یوسف نے اپنے دو افسانوں ''سرخ پان'' اور ''جنتا راج'' کے سلسلے میں بتایا کہ وہ سب سے پہلے تخلیق کئے گئے تھے مگر پکی روشنائی میں چونکہ ''پکا ارادہ'' ہی منظر عام پر آسکا تھا اس لئے اپنا پہلا طبع شدہ افسانہ وہ اسے ہی مانتے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں ہی احمد یوسف نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ازسرنو تشکیل کی جس کے سکریٹری حسن نعیم مقرر ہوئے۔ انجمن کی نشستوں میں جو لوگ اس وقت باضابطہ طور پر تھے ان میں نادم بلخی، نوشاد نوری، مقبول احمد شبنم، افتخار احمد، حسن سمیع، سید یوسف حسن، مطیع الرحمٰن شمیم اور خود احمد یوسف کے نام اہم ہیں۔ بعد کے زمانے میں اس کے ممبروں میں بتدریج اضافہ ہی ہوتا رہا۔ شہزاد معصومی، انیس امام کی آمد کے ساتھ یہ سلسلہ روز افزوں آگے بڑھتا ہی رہا۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد شکیل الرحمٰن، کلام حیدری، خواجہ بدیع الزماں (جو ان دنوں بدیع مشہدی کے نام سے لکھتے تھے)، شاہد انور (سید محمد علی)، انور عظیم اور منظر شہاب آئے۔ یہ حضرات اپنی اپنی یونیورسٹیوں سے بی اے کر کے پٹنہ آ چکے تھے اور یہاں ایم اے میں داخلہ لے رکھا تھا۔ اس طرح انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں اب بڑی رونق آ چکی تھی۔ یہاں کبھی کبھی سہیل عظیم آبادی بھی آ جایا کرتے تھے۔ لیکن جب کبھی پرگتی شیل لیکھک سنگھ اور

انجمن ترقی پسند مصنفین کی ملی جلی نشست ہوتی تو اس میں ہندی کے بھی کافی لوگ شریک ہوتے۔ ایسی نشستوں میں شریک ہونے والے ہندی کے لوگوں میں کوی ناگ ارجن، کنہیا جی، تیج نارائن جھا، گرجا بابو، پروفیسر کپل منی تیواری، نریندر، علی اشرف اور حبیب الرحمٰن جیسے لوگ ہوا کرتے تھے۔

۴۹۔۱۹۴۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین اس دور کی کمیونسٹ پارٹی کی براہ راست کلچرل ونگ تھی۔ اس لئے اس سے جڑے لوگوں کے درمیان بحث ومباحثے کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ کیوں نہ یہ لوگ مزدوروں اور کسانوں کی جنگ کا براہ راست اپنی نگارشات میں ذکر کریں۔ یوں بھی جب روپوش کامریڈوں سے احمد یوسف کی ملاقات ہوا کرتی تو ان کا یہ تقاضا ہوتا کہ بیڑی مزدوروں، رکشا چلانے والوں اور صنعتی مزدوروں کی ٹریڈ یونین تحریکات کے متعلق بھی اپنی تخلیقات میں انہیں ذکر کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ ہر نظم کے اور ہر افسانے کے اختتام پر ایک سرخ روشنی تیزی سے جھلملا کر افسانے کو یا اس نظم کو ایک تحریک کی علامت بنا دیتی تھی۔

پھر اس کے بعد ۵۱۔۱۹۵۰ء سے جب ان لوگوں نے اپنے سفر کا جائزہ لیا تو یہ محسوس ہوا کہ یہ لوگ تو اب تک بے جان چیزیں لکھ رہے تھے۔ ان کا شمار پروپگنڈائی ادب کے زمرے میں تو کیا جاسکتا تھا مگر وہ Genuine ادب نہیں بن سکتا تھا۔ چنانچہ انھیں اب ازسرنو اپنی تخلیقات یعنی فنی کاوشوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت آن پڑی تھی۔

احمد یوسف نے اس وقت تک کوئی ڈیڑھ درجن افسانے لکھ ڈالے تھے لیکن ۵۰۔۱۹۵۱ء میں نئی فکر کا سلسلہ شروع ہوا تو انھوں نے ان افسانوں میں سے تقریباً نصف سے زائد افسانے ردّ کر دیئے۔ اس وقت انھیں یہ احساس ہوا کہ بغیر کسی اندرونی جذبے کے اور ایک باطنی کرب کے کچھ لکھا نہیں جاسکتا اور اگر کچھ لکھا گیا تو وہ شئے ادب کے زمرے میں نہیں آئے گی۔ کچھ یہی حال ان کے دوسرے ساتھیوں کا بھی تھا۔ وہ لوگ بھی اسی انداز سے سوچ رہے تھے۔ ان کا تعلق لکھنے پڑھنے والی اس Generatoin سے ہے جو آزادی کے بعد آئی تھی۔ یہ مسئلہ دراصل کرشن چندر وغیرہ کا نہیں تھا۔ اسی زمانے میں ایک ادبی بحث چلی کہ کیا ادب جمود یا تعطل کا شکار ہے؟ کچھ لوگ کہتے تھے کہ جمود نہیں ہے بلکہ پروپگنڈائی اور غوغائی ادب نے صحیح ادب کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ بہت سی باتیں بحث کے دوران آئیں جن میں یہ بات بھی آئی کہ وہ جو آزادی سے پہلے ایک موضوع تھا، حصول آزادی کے لئے سامراجی اور سامنتی طاقتوں سے جنگ کا یا

نبرد آزمائی کا، وہ دور ختم ہو چکا۔ فسادات کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ پھر بحث یہ رُخ اختیار کر لیتی کہ کیا واقعی ملک آزاد ہو گیا کہ سیاسی آزادی تو ضرور آ گئی لیکن اب بھی ہم اقتصادی غلامی سے دو چار ہیں اور ہمارا معاشی اور سماجی استحصال ہو رہا ہے۔ اتنا ہی جتنا انگریزوں کی حکومت میں ہوا کرتا تھا۔ ملک میں جہالت ہے، بے روزگاری ہے، بیکاری ہے اور ملک سینکڑوں سال کی غلامی کے نتیجے میں اب بھی ذہنی افلاس، تنگ نظری، عصبیت اور توہم پرستی کا شکار ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی سامنے آئی کہ ادب کسی تحریک کا آلہ کار نہیں بن سکتا اور گوناگوں سماجی مسائل راست انداز میں اس کے اندر نہیں آسکتے کیونکہ ادب کے تقاضے صحافت کے تقاضوں سے یکسر مختلف تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنی ساری الجھنیں لکھنے پڑھنے والوں کے سامنے تھیں کہ کئی برسوں تک یہ سبھی لوگ سوچتے رہے کہ کسی طور پر نئی فکر کو ادب میں جگہ دی جائے اور قلم کو کسی طرح جلا بخشی جائے۔ اس عرصے میں واقعہ یہ ہے کہ لوگوں نے بہت کم لکھا (میری مراد ۱۹۴۷ء کے بعد والی نسل سے ہے جس سے احمد یوسف کا تعلق ہے)۔ اوپر کی نسل میں منٹو کا ۱۹۵۵ء میں انتقال ہو چکا تھا____ بیدی سال دو سال میں ایکا دھ افسانہ لکھ لیتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کا بھی یہی حال تھا۔ ہاں کرشن چندر لکھ رہے تھے لیکن یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اب وہ تیزی سے کمرشیل ہوتے جا رہے ہیں اور جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ پیسے کمانے کے لئے لکھ رہے ہیں۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کی نسل اور ان کے اوپر کی نسل کے لوگ بھی ایک فکری خلا سا محسوس کر رہے تھے کہ اب نئے ہندوستان میں وہ کن موضوعات کو اپنائیں۔ رفتہ رفتہ راہ ہموار ہوتی گئی اور یہ بات انھیں سمجھ میں آنے لگی کہ نئے ہندوستان کے سیاسی خدوخال سیکولر اور جمہوری ہوں گے۔ ملک نے جب سیاسی آزادی حاصل کر لی ہے تو اسے اقتصادی آزادی بھی حاصل کرنی ہوگی اور ادیبوں کو اپنی فکر کا رُخ اس سمت کو موڑنا ہوگا کہ جس سے آزاد وطن میں بھائی چارگی اور امن وامان کا ماحول رہے۔ اکثریت اور اقلیت میں آپس میں میل ملاپ رہے۔ ملک سے جہالت، افلاس، بیروزگاری اور بے کاری دور ہو اور ملک کی معیشت کو بہتر بنایا جائے۔

لہٰذا یوں سمجھیں کہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں بہت کم لکھا گیا لیکن جو کچھ بھی غیر تجارتی Non Commercial چیزیں لکھی گئیں وہ کم وبیش اسی انداز کی تھیں۔ اردو کے لکھنے والوں کے ساتھ ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ جس اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتے تھے وہ وقفے وقفے پر ایک سنگین قسم کے فساد سے دو

چار ہوتا رہتا تھا اور یوں ان کے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا ہونے لگا اور یہ چیز ان کی تحریروں میں بھی جگہ پانے لگی۔ یوں اس دور کے لکھنے والوں میں جوگندر پال، انور عظیم، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، اقبال متین، رام لعل اور جیلانی بانو وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ کچھ مقامی موضوعات اور مقامی مسائل بھی لوگوں کی تحریروں میں جگہ پا جاتے تھے مثلاً حیدر آباد کے لکھنے والے اقبال متین، جیلانی بانو، عوض سعید اور واجدہ تبسم وغیرہ کے یہاں شدت سے ایک جاگیردارانہ انحطاط پذیر معاشرے کی تصویر ملتی ہے۔ جاگیرداروں کی عیاشیاں اور ان کی زندگی کا روحانی کھوکھلا پن اور ان کی تیزی سے بگڑتی ہوئی اقتصادی حالت کو ان ادیبوں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ اس طرح پنجاب سے آنے والوں کو دیر تک اپنے وطن کی یاد ستاتی رہی اور پنجاب کے بٹنے یا تقسیم ہونے کے غم کے علاوہ پنجاب کے انسانیت کش فسادات دیر تک خوف کے آنسو رلاتے رہے۔ یو پی کے لکھنے والوں کے یہاں کچھ مقامی مسائل اور مقامی موضوعات تھے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں مقامی تہذیب کی جھلکیاں جا بجا دکھائی دیتی تھیں۔ قاضی عبدالستار کے یہاں جاگیردارانہ انحطاط پر ہمیں کئی افسانے ملتے ہیں لیکن 'پیتل کا گھنٹہ' ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

بہار کے لکھنے والوں میں ایک تو مقامی تہذیب اور مقامی مسائل افسانے میں آجاتے تھے پھر ایک جاتی ہوئی بزم کا غم ایسا تھا جو اقلیتی فرقے کے لکھنے والوں کے یہاں مشترکہ غم کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کی دہائی کے فسادات اور پھر اس کے نتیجے میں جو خوف و دہشت دلوں میں پیدا ہو رہی تھی وہ بھی جا بجا ان کی تحریروں میں آجاتی تھی۔ بہار کے لکھنے والوں میں کلام حیدری نے انہی دنوں ایک معرکۃ الآرا افسانہ ''سخی'' لکھا تھا جس کے متعلق احمد یوسف نے کہیں لکھا تھا کہ وہ افسانہ ''کفن'' کی توسیع پیش کرتا ہے۔

احمد یوسف کی نسل کے لکھنے والوں کے بعد ۶۰۔۶۵ کے دور میں افسانہ نگاروں کی ایک اور نسل سامنے آتی ہے جس کے قابلِ ذکر لوگوں میں شفیع جاوید، ظفر اوگانوی، شفیع مشہدی، رشید امجد، علی حیدر ملک، نورالہدیٰ سید اور اے۔ خیام کے نام اہم ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے تو جدید افسانے کے تجربے کئے اور کچھ لوگوں نے راست طریقۂ تحریر کو اپنایا لیکن ترقی پسندوں سے ان کا خاصا فاصلہ دکھائی دیتا ہے۔

درج بالا افسانہ نگاروں میں شفیع جاوید کی زبان بہت ہی خوبصورت ہے اور وہ سماج کے ان برسر آوردہ لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جو سب کچھ کے رہنے کے باوجود تنہائی کا کرب جھیل رہے ہیں۔ ان کے

یہاں کبھی کبھی تصوف کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور کہیں کہیں بزرگوں کا ذکر بھی چلا آتا ہے۔

ظفر اوگانوی کے افسانوں کی فضا کچھ مبہم ہے اور باتیں بھی پورے طور پر گرفت میں نہیں آتیں ہیں لیکن یہ محسوس ضرور ہوتا ہے کہ وہ نئی زندگی کے ساتھ معاشرے کے کوائف کو بیان کر رہے ہیں جس میں صنعتی دور کے فرد کا کرب بھی شامل ہے۔ اسی طرح علی حیدر ملک کے یہاں چھوڑی ہوئی بستیوں کا غم اور بے زمینی ایک مشترکہ موضوع ہے۔

اس کے کچھ ہی دنوں بعد ۱۹۷۰ء کا زمانہ آتا ہے جہاں جدید رجحان کے زیر اثر زیادہ تر افسانے تحریر کئے گئے۔ شوکت حیات، شفق، حسین الحق، عبدالصمد، محمد منشاء یاد، طارق چھتاری، احمد داؤد، عبید قمر، ابواللیث جاوید، حمید سہروردی، سلام بن رزاق، شموئل احمد، انور قمر، قمر احسن، علی امام نقوی، انور خاں، علی امام، مشتاق احمد نوری اور انیس رفیع کے علاوہ اور بھی کئی اہم افسانہ نگار اس دور سے وابستہ رہے ہیں۔

شوکت حیات نے اپنے مشہور افسانہ 'بانگ' میں ایک تمثیلی فضا قائم کی ہے۔ اس افسانہ پر باوجودیکہ Orwell کے ناول Animal Farm کی گہری چھاپ نظر آتی ہے پھر بھی اسے وہ افسانے کے توسط سے بہ آسانی پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

حسین الحق کے یہاں ایک ناسٹیلجیائی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ انھیں پرانی بزم کی یادیں اور قدیم اخلاقی قدریں یاد آتی ہیں۔ حسین الحق کے یہاں تصوف سے گہری دلچسپی بھی دکھائی دیتی ہے جو انھیں بار بار ماضی کے کھنڈروں میں لے جاتی ہے لیکن دلچسپ یہ ہے کہ وہ وہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتے کچھ لے کر لوٹتے ہیں۔

شفق بہار کے ایک بہت ہی چھوٹے شہر سے وابستہ رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں وہاں کی زندگی اور اس سے متعلق ڈھیروں مسائل کے ساتھ بہت ساری محرومیاں بھی ہمیں بطور خاص دکھائی دیتی ہیں جو اپنے بیان کے اعتبار سے بڑی وسعت کی حامل بن جاتی ہیں۔

عبدالصمد کے یہاں بھی مسائل ہیں مگر اس کے علاوہ انسانی رشتوں کا خوبصورت بیان بھی جا بجا ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔

سلام بن رزاق، انور قمر اور علی امام نقوی وغیرہ کا بمبئی سے تعلق ہے۔ چنانچہ بمبئی کی زندگی سے وابستہ وہاں کے صدہا مسائل ہیں اور صدہا انسانی نفسیات ہیں اور ان کا بغور مشاہدہ ہی دراصل ان کے فن کا

لب ولباب ہے۔احمد داؤد کے یہاں پاکستان کے سیاسی سیاق وسباق میں ایسے افسانے ملتے ہیں جن میں نوکرشاہی اور عامریت کے خلاف بھرپور منافرت کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔

اس کے بعد کے لکھنے والوں میں قاسم خورشید، اختر واصف، رحمٰن شاہی، سید محمد اشرف اور مشرف عالم ذوقی وغیرہ کے نام بطورِ خاص لئے جاسکتے ہیں۔

قاسم خورشید نے ایک نہایت اچھا سا افسانہ 'پوسٹر' تحریر کیا ہے جو بھوک جیسی جان لیوا شئے پر مبنی ہے۔افسانہ میں ایک ننگے بھوکے بچے کا قصہ یہ ہے کہ وہ بھوک کی شدت کے سبب پوسٹر چپکانے والوں کے ڈبے کی لئی آنکھ بچا کر کھا جاتا ہے۔

سید محمد اشرف کا 'ڈار سے بچھڑے' ایک مشہور افسانہ ہے جو تقسیم شدہ خاندانوں کے ذہنی آلام وکرب کے موضوع پر تحریر کیا گیا ہے۔افسانہ میں ہندوستان اور پاکستان کے ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کو یاد کرتے ہیں اور اپنے دل میں ان سے ملنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی گہرے سماجی سروکار کے افسانہ نگار ہیں۔اپنے افسانوں میں وہ ہمیں کوچہ وبازار کے قصے سناتے ہیں۔اپنے سماج اور اس سے وابستہ زندگی کے بہت سے جلووں کو وہ بڑی گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بڑی مہارت سے اپنے فن کا حصہ بنالیتے ہیں۔

احمد یوسف کے ادبی سفر، فنی محرکات، فنی معتقدات نیز ان کے موضوعات پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ متذکرہ فنکار سب سے پہلے اپنے گرد ایک ذہنی پس منظر تیار کرتا ہے اور اس کے بعد ہی وہ تخلیق کی طرف رجوع کرتا ہے۔احمد یوسف کی عمر ابھی قریباً پانچ چھ سال کی ہی تھی کہ ان کے والد نے انھیں شکوہ جواب شکوہ، نصف کے قریب مسدس حالی اور اکبر کا ڈھیر سارا کلام ازبر کرا دیا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب احمد یوسف مدرسہ عالیہ کلکتہ میں درجہ دوم میں پڑھا کرتے تھے۔

بعد میں احمد یوسف جب پٹنہ آئے اور اپنے والد کی یاد کرائی ہوئی چیزیں انھوں نے اپنے دادا حضور کو سنائیں تو انھوں نے توبتہ النصوح رٹوانا شروع کر دیا۔ساتھ اس کے انھوں نے کچھ رتن ناتھ سرشار کے مضامین بھی رٹوا دیئے۔اس طرح نصف کے قریب توبتہ النصوح بھی مصنف کو بالکل یاد ہوگئی۔یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ پٹنہ ہی میں احمد یوسف نے قرآن شریف کا فقط تیسواں پارہ حفظ بھی کیا تھا۔اس کے بعد وہ پھر کلکتہ واپس چلے گئے اور نثر کا بہت سارا حصہ جو دادا نے انھیں یاد کرایا تھا وہ ذہن سے جاتا رہا۔یہی حال

شکوہ جواب شکوہ اور مسدس حالی کا بھی ہوا کہ ان کا بھی ایک تہائی حصہ احمد یوسف نے بھلا دیا۔احمد یوسف کے سلسلے میں یہ قصہ بھی دلچسپ ہے کہ سات آٹھ برس کے سن میں جب وہ پٹنہ آتے تھے تو ان کے دادا اپنے دوستوں کے درمیان انھیں کھڑا کر دیتے تھے اور کہتے تھے 'شکوہ سناؤ' اور جب وہ پوری نظم سنا دیا کرتے تھے تو انھیں ایک روپئے کا سکہ ملتا تھا جو ان کے دادا کے کوئی دوست بطور انعام دیا کرتے تھے۔اس وقت کے ایک روپئے کی اہمیت کا اندازہ اس طرح سے لگایا جاسکتا ہے کہ مصنف نے بارہ آنے میں پٹری کے ساتھ چلنے والی ایک ٹرین خریدی تھی۔بہرحال یہ سارے زمانے گزر گئے۔دادا کا انتقال ہوگیا۔

جیسا کہ میں نے قبل عرض کیا کہ احمد یوسف نے ۱۹۴۴ء میں ہائی اسکول پاس کیا اور پھر اس کے بعد علی گڑھ چلے گئے۔وہاں ۱۹۴۸ء تک ان کا قیام رہا اور وہیں سے انھوں نے بی۔ایس۔سی تک کی تعلیم حاصل کی۔۱۹۴۶ء وہ سال تھا جب احمد یوسف کو ادب پڑھنے کا کافی موقع ملا۔اسی زمانے میں انھوں نے کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، اختر اور ینوی اور سہیل عظیم آبادی کو پڑھا۔ادھر فرنچ فکشن میں موپاساں اور فلابیئر کو پڑھا اور اسی طرح روسی فکشن میں چیخوف، تالستائی اور دوستوؤسکی کو پڑھا۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں احمد یوسف نے کچھ مضامین بھی لکھے جو رشید احمد صدیقی کا بڑا ہی بھونڈا چربہ دکھائی دیتے تھے۔مگر ۱۹۴۸ء سے احمد یوسف نے باضابطہ لکھنا شروع کیا اور اب انھوں نے یہ کوشش کی کہ اپنی راہ آپ نکالی جائے جو سبھوں سے ہٹ کر بھی ہو اور سبھوں سے مختلف بھی۔اس عمل میں کچھ نہ کچھ اثرات تو ماقبل کے تخلیق کاروں کے ضرور ہوتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ فنکار ان سے الگ ہوتا جاتا ہے۔احمد یوسف کا سب سے پہلا افسانہ ''سرخ پان'' ۱۹۴۸ء میں لکھا گیا تھا جو کلکتہ کے فساد کے موضوع پر تھا۔پھر ۱۹۴۹ء میں ان کا ایک دو افسانہ مزید منظر عام پر آیا۔اس زمانے میں اردو کا بڑا برا حال تھا۔ادبی رسائل بہت کم تھے جیسے الہ آباد سے ایک رسالہ ''کارواں'' نکلا کرتا تھا جس کی ادارت میں ڈاکٹر اعجاز حسین کا نام ہوتا تھا۔بمبئی سے 'شاعر' نکلتا تھا اور دلی سے ''شاہراہ'' نکلتا تھا۔''شاہراہ'' انجمن ترقی پسند مصنفین کا باضابطہ آرگن تو نہیں تھا لیکن ترقی پسند تحریک کا ہمنوا ضرور تھا۔ پرکاش پنڈت جب تک اس کے مدیر رہے پرچہ بہت صاف ستھرا نکلتا تھا اور اس میں چھپنا نئے لوگوں کیلئے تو یقیناً باعث صد افتخار ہوا کرتا تھا۔پاکستان سے خاصی تعداد میں رسائل نکلتے تھے لیکن وہ لوگ بیشتر Stablished لوگوں کو ہی چھاپتے تھے لیکن اس کے باوجود اس دور میں احمد یوسف کا ایک افسانہ بعنوان ''مسافر'' افکار کراچی میں شائع ہوا تھا۔یہ ۵۱-۱۹۵۰ء کی بات ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین پٹنہ نے ''نئی راہ'' کے نام سے اپنا ایک آرگن نکالا جس کے دو شمارے آئے اور دونوں میں ان کے افسانے شائع ہوئے۔ اس وقت تک احمد یوسف ع۔ یوسف کے نام سے لکھتے تھے۔لیکن پہلی بار تہذیب میں جب ان کا افسانہ ''گھن'' شائع ہوا تو انھوں نے اسے احمد یوسف کے نام سے تحریر کیا تھا۔اس طرح سے 'افکار' کا افسانہ بھی احمد یوسف ہی کے نام سے چھپا۔پٹنہ سے جب ''اشارہ'' نکلا تو وقتاً فوقتاً قیوم خضر ان کے افسانے بھی لیا کرتے تھے۔اس طرح سے یہ سلسلہ چلتا رہا۔احمد یوسف کے سلسلے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اس دور میں انھوں نے جو افسانے لکھے وہ یقینی طور پر ترقی پسند افسانے تھے لیکن اس کے باوجود ان میں نعرے بازی یا مینی فیسٹو کی تشہیر نہیں کی گئی تھی۔ پٹنہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی یہ اکائی ۴۹۔۱۹۴۸ء سے ۵۵۔۱۹۵۴ء تک چلی اور اس کے بعد لوگ بکھرتے گئے۔حسن نعیم کلکتہ چلے گئے۔ بدیع اڑیسہ چلے گئے۔شکیل اڑیسہ چلے گئے۔انور عظیم دلی چلے گئے۔نادم بلخی ڈالٹین گنج چلے گئے۔احمد یوسف یہاں تنہا رہ گئے اور بس کہ ان کے لکھنے پڑھنے کا کاروبار چلتا رہا۔تب انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ اگر تخلیق کار میں سچی لگن ہو تو کسی ادبی تحریک یا ادبی اجتماع کی اسے چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

۶۲۔۱۹۶۱ء میں ''راوی'' پٹنہ کا اجراء ہوا۔یہ ایک ایسا رسالہ تھا جس میں صرف افسانے ہی شائع ہوا کرتے تھے۔ برعظیم ہندو پاک کے سبھی چھوٹے بڑے افسانہ نگار اس میں شائع ہوئے۔راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر وغیرہ اس سلسلے کے اہم نام ہیں۔اس کے بارہ شمارے منظر عام پر آئے اور ان میں سے دو شماروں میں مصنف کے افسانے شائع ہوئے۔ایک ''عبدالرحیم ٹی اسٹال'' اور دوسرا ''چراغ کشتہ''۔تقریباً اسی زمانے میں ''تلاش'' دہلی میں احمد یوسف کا ایک افسانہ شائع ہوا ''بس یہی کچھ لوگ''۔ ''تلاش'' بھی سال بھر تک ہی نکلا اور ایک سالنامے پر دم توڑ گیا۔۶۵۔۱۹۶۴ء سے جدیدیت کا دور شروع ہوا۔اس کے بعد ہی ''شب خون''، ''کتاب''، ''مزاج'' کے علاوہ کچھ اور اچھے رسائل بازار میں آئے۔۶۰ کے عشرہ کے آخری سرے پر ''آہنگ'' بھی گیا سے آ گیا۔اس دور میں انھوں نے کافی افسانے لکھے۔احمد یوسف کا پہلا مجموعہ ''روشنائی کی کشتیاں'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا جس میں ۲۰ افسانے تھے۔پھر ۱۹۸۰ء میں ''آگ کے ہم سائے'' ان کا دوسرا مجموعہ آیا اس میں ۲۱/افسانے تھے۔''۲۳/گھنٹے کا شہر'' ۱۹۸۴ء میں آیا جس میں ۲۰ افسانے تھے۔''رزم ہو یا بزم ہو'' ان کا آخری افسانوی مجموعہ تھا جو ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آیا تھا۔متذکرہ مجموعہ

۲۰/افسانوں پر مشتمل تھا۔

۱۹۸۸ء میں ان کا ایک رپورتاژ کا مجموعہ ''محفل محفل'' شائع ہوا۔انھوں نے تقریباً ۱۰۰/افسانے ''جلتا ہوا جنگل'' ناولٹ ''دل کے قریں رہتے ہیں'' خاکے، کچھ مضامین، افسانوں کے تجزیے و چند تبصرے لکھے۔

تخلیقی عمل میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ موضوع اور ہیئت کے ساتھ مصنف کس طرح انصاف کرتا ہے۔کہیں موضوع ایسا تو نہیں ہے جو اتنا کھردرا ہو کہ صحافت کے زمرے میں آجائے اور ہیئت اتنی بھدی تو نہیں جو بھدے قسم کے قصے کہانیوں کی صف میں آجائے۔ اسی طریقے سے موضوع کا Abstraction اور اس کا زیادہ مبہم ہونا، افسانے کو شاعری بنا دینا بھی کوئی مستحسن فعل نہیں۔ دراصل موضوع اور ہیئت ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں اور ان کے بہترین امتزاج سے ہی فن کی تخلیق ہوتی ہے۔

احمد یوسف نے حتی المقدور یہ کوشش کی ہے کہ بہ اعتبار موضوع افسانے صحافت نہ بن جائیں اور بہ اعتبار ہیئت لوگ انھیں شعری تخلیق نہ سمجھنے لگیں۔

انھوں نے جس سماج میں آنکھ کھولی تھی وہ چھوٹے زمینداروں اور تجارت پیشہ لوگوں کا سماج تھا۔یعنی ایک طرف تو دادا زمیندار تھے تو دوسری طرف والد سائیکل کا ان کے دو چچا کے اشتراک سے اچھا خاصا کاروبار کر رہے تھے۔۱۹۴۷ء کا واقعہ اور تقسیم ملک ایک ایسا حادثہ تھا جس نے سبھوں کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ایک طرف تو بڑی آباد اور بے حد روشن بزم تھی جو یک بیک اجاڑ ہو گئی۔کہاں گئے وہ لوگ؟ پتہ چلا کوئی مشرق کو سدھارا تو کوئی مغرب کو۔پھر تقسیم وطن کے بعد فسادات کا طویل سلسلہ چلا جس پر تقریباً حساس تخلیق کار نے کچھ نہ کچھ لکھا۔جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ احمد یوسف نے بھی ''سرخ پان'' کے عنوان سے ایک افسانہ تحریر کیا تھا۔ان لوگوں کی یہ کوشش تھی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ نظریہ بھی تھا کہ لوگ اس طرح کے نقلِ مکانی یا ہجرت کو بڑھاوا نہ دیں۔ جو کچھ ہوا سو ہوا۔اب اس بزم کو نئے طور سے آراستہ کرنا ہے اور ملک کو اقتصادی آزادی دلانا ہے کہ اس وقت تک بیرونی سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا تھا اور اس طرح سیاسی استحصال تو ختم ہو گیا تھا لیکن معاشی استحصال باقی تھا۔رفتہ رفتہ ان کے بزنس اور تجارتی مفادات کم ہوتے گئے پھر بھی معاشی استحصال باقی رہا بلکہ یوں کہیں کہ معاشی استحصال کے ساتھ ساتھ سماجی استحصال اور مذہبی استحصال سبھی موجود تھے۔یہ لوگ سوچتے کہ کیا ایک تخلیق کار ان سارے سماجی مظالم سے اپنی آنکھیں چرا سکتا ہے؟

اور پھر غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے کہ یہ قطعی ناممکن ہے۔ اگر کچھ دیر ایک تخلیق کار بہت کچھ ایران اور توران کی ہانکے تو بھی جب وہ ان باتوں سے فرصت پا جائے گا تو اپنے ارد گرد ضرور دیکھے گا اور جب اسے معلوم ہوگا کہ یہاں بھوک ہے، افلاس ہے، پسماندگی ہے، بیکاری ہے تو پھر وہ ان باتوں کی طرف یقینی طور پر متوجہ ہوگا۔ چنانچہ برطانوی ہندوستان میں بھی یہ موضوعات تخلیق کاروں کے سامنے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر آزادی کی جنگ کا موضوع ان کے سامنے تھا اور یہ مشترک موضوع تھا۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی آئی اور ملک آزاد ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ ہم آزاد تو ہو گئے لیکن ہماری ذہنی پسماندگی کا یہ حال ہے کہ ہم آپس میں کشت و خون کرتے ہیں اور ہنوز انگریزوں کی اس پالیسی سے کہ 'ہندوستانیوں کو لڑاؤ اور حکومت کرو' سے چھٹکارا نہیں پا سکے ہیں۔ احمد یوسف کے افسانوں میں جا بجا یہ باتیں آئیں مثلاً سماجی اور معاشی استحصال، پسماندگی، بے کاری کے علاوہ ایک وہ غم ہے جو ایک بے حد ہنستی بولتی ہوئی مجلس کے ٹوٹ جانے کا غم ہے۔ ہمارے عزیز و اقارب، ہمارے اعزا، ہمارے بزرگ ہجرت کر کے سرحد کی دوسری جانب چلے گئے اور اب یہ عالم ہے کہ نہ ہمیں ان کی خبر ملتی ہے اور نہ انہیں ہماری خبر۔ ''تلوار کا موسم'' میں بطور خاص اس دکھ کا بڑا اچھا اظہار ہوا ہے۔ ناسٹیلجیا اور پرانی یادیں بھی ان کے افسانوں کا موضوع بنی ہیں۔ ''عبدالرحیم ٹی اسٹال'' و ''سایۂ رمِ آہو'' میں ناسٹیلجیا اور پرانی یادیں بھرپور طریقے سے ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں ناسٹیلجیا کا خاصا اہم رول رہا ہے۔

تقسیم شدہ خاندان کے موضوع پر جو افسانے مصنف نے لکھے ہیں ان میں ''قربت کی دوری'' اور ''وقت رخصت'' کا خاص طور پر نام لیا جا سکتا ہے۔ مزید ایک موضوع یعنی ایک جنگ کا خطرہ جو آن ہی آن میں ساری انسانیت کو تباہ و برباد کر دے گا، ان کے یہاں جا بجا ملتا ہے۔ بطور مثال ان کا ایک افسانہ ہے ''ایک لہکتے دن کا آخری جام'' جہاں ایک باغ میں کچھ سر پھرے آتے ہیں اور پھر آپس میں لڑ جھگڑ کر کشت و خون کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اور بڈھا باغبان پوچھتا ہے کہ ''سب کچھ اپنے ساتھ لائے تھے تو پھر اپنی قبریں کیوں نہیں لائے تھے''۔ ظلم و استبداد کے سلسلے میں ان کا خیال یہ ہے کہ آج کا ہر ظلم اپنے ماقبل کے ظلم کی توسیع کرتا ہے۔ اس موضوع پر بھی ان کے کچھ افسانے ہیں جن میں ''ورثہ'' کا نام بطور خاص لیا جا سکتا ہے۔ ایک موضوع Unity in diversity کا ہے جس پر مصنف کے کئی افسانے ہیں جن میں ''خواب گر خواب شکن'' کا نام بے حد اہم ہے۔ ''بڑے گپتا چھوٹے گپتا'' ایک مشترک تہذیب کی یاد دلاتا ہے اور ہندو مسلم اتحاد کی اعلیٰ

مثالیں پیش کرتا ہے۔

احمد یوسف کا ذاتی خیال یہ ہے کہ سماج آج جو تعطل و جمود کا شکار ہے اور جس اخلاقی زوال سے دو چار ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اب سماج میں بے لوث اور مثالی شخصیتیں نہیں آ رہی ہیں۔ مصنف نے اپنے کچھ افسانوں میں اس بات کی بطور خاص کوشش کی ہے کہ ایسے کرداروں کو سامنے لایا جائے جو سماج میں اپنے بے لوث پن سے اور اپنے اعلیٰ کردار سے ایک اعلیٰ اخلاقی ضابطے کو بحال کر سکیں۔ چنانچہ یہ خیال اور یہ موضوع ان کے افسانہ ''دشت بہ دشت کو بہ کو''، ''آنے والا'' اور ''دکھ ہما شما کے'' میں ملتا ہے۔

غرض کہ احمد یوسف کا یہ عقیدہ ہے کہ تخلیق کار کبھی سماج دشمن نہیں ہو سکتا۔ وہ فسطائی طاقتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ تو صاحب دل ہوتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ سماج میں خوشی آئے۔ لوگ پسماندگی، بے کاری اور جہالت سے چھٹکارہ حاصل کریں۔ وہ وسیع النظر، وسیع القلب اور وسیع الدماغ ہوں اور تنگ نظری و عصبیت سے دور رہیں۔ ایک اعلیٰ تخلیق کار کا اعلیٰ انسان ہونا ضروری ہے اور ایک اعلیٰ انسان ہمیشہ سماج کو اعلیٰ سطح پر دیکھنا چاہتا ہے، ایک ایسی سطح پر جہاں کسی قسم کا استحصال نہ ہو۔ وہ جنگ سے نفرت کرتا ہے اور ایک ہنستی کھیلتی زندگی کا ہمنوا ہوتا ہے۔

افسانوی مجموعوں کا تعارف

افسانوی مجموعہ 'روشنائی کی کشتیاں' :

احمد یوسف کا افسانوی مجموعہ ''روشنائی کی کشتیاں'' ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ کل بیس افسانوں پر مشتمل ہے۔ مشمولہ افسانوں کے عنوانات ہیں: 'بیس کاریگر'، 'عبدالرحیم ٹی اسٹال'، 'سایۂ رم آہو'، 'دبے پاؤں'، 'لالٹین کی روشنی'، 'میرا ہی لہو'، 'تجدید جنوں'، 'غم زدوں کی برات'، 'پرندہ ایک نگار خانے کا'، 'تلوار کا موسم'، 'مخالف سمتوں کا سفر'، 'پتھر کی زبان'، 'سنگین کے دو کنارے'، 'ہم تھے اور شہر تھا'، 'ایک سے آگے'، 'شادکامی کا دوسرا لمحہ'، 'تین گھروں کی آبادی'، 'ایک لہکتے دن کا آخری جام'، 'اس کے بعد' اور 'روشنائی کی کشتیاں'۔

مجموعہ کے متذکرہ افسانوں میں افسانہ ''تلوار کا موسم'' دراصل اس موسم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک ضعیف العمر کے لئے جبر و قہر کا موسم ہے۔ افسانہ شعور کی رو کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ جہاں وہ معمر شخص ہے جس کی شعور کی رو کبھی پیچھے کی سمت کا سفر کرتی ہے کبھی حال کا سفر کرتی ہے اور کبھی مستقبل کے متعلق بھی کچھ سوچ لیتی ہے۔

عالم یہ ہے کہ آزادی کو کئی سال ہو چکے ہیں۔ ملک بھی تقسیم ہو چکا ہے اور مسلمانوں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ نئی مملکت کو جا چکا ہے اور اب نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ ادھر اپنے ملک میں زمینداری ختم ہونے کا اس معمر شخص پر بڑا اثر یہ ہے کہ ایک ذریعہ معاش جو عرصہ سے چلا آ رہا تھا وہ ختم ہو چکا ہے اور ایک سوالیہ نشان سامنے ہے کہ آگے کا راستہ اب کس طرح طئے ہو۔

جیسا کہ میں نے سطور بالا میں عرض کیا ہے کہ وہ شخص کبھی پیچھے کی طرف جاتا ہے کبھی حال کے متعلق سوچتا ہے اور کبھی مستقبل کی جانب نظر ڈالتا ہے:

''کتنے ہی مہ و سال صفیں بنائے، ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ ان ہی گذرے ہوئے ساتھیوں کی قربت میں سکون بھی ملتا ہے، ان ہی رفیقوں کے دم سے انتشار

قلب بھی نصیب ہوتا ہے۔''

(روشنائی کی کشتیاں/ احمد یوسف۔ افسانہ۔ ''تلوار کا موسم''، ص۹۴)

زمینداری کے خاتمے کے بعد جن حالات کا سامنا ہے ان کے متعلق غور و فکر کے نتیجے میں اسے اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہے کہ کیا آرام اور آسودگی کا زمانہ تھا اور اب کیا زمانہ آ گیا ہے۔ کس طرح ہم لوگ خورد و نوش کی فکر سے آزاد تھے اور گھر میں غلّے کی کوئی کمی نہیں ہوا کرتی تھی:

''غلّے کی کوٹھیوں کے منہ کھلے ہیں۔ گاؤں سے غلے کی بیل گاڑیاں آ رہی ہیں۔

رام ....اے

....رام

دو ....ای ....دو

کوٹھیوں کے پنجر میں نے تڑوا دیئے کہ ان کے خالی سینے سے بڑی بھیانک اور دل خراش آوازیں نکلتی تھیں۔

رام..اے .... رام

دو ....ای ....دو

وقت لاکھ ستم ڈھاتا لیکن یہ تلوار تو نہ چھوڑ جاتا۔''

(روشنائی کی کشتیاں/ احمد یوسف۔ افسانہ۔ ''تلوار کا موسم''، ص۹۶)

پھر وہ ایک حالیہ حادثے کے متعلق سوچتا ہے جو اس کے سگے بھائی کی موت کے سانحہ سے متعلق تھا جنھوں نے کچھ دن پہلے پاکستان میں وفات پائی تھی۔ وہ بڑی مشکلوں سے پاسپورٹ وغیرہ بنوا کر وہاں جاتا ہے۔ بھتیجے خوش ہوتے ہیں۔ بھاوج خوش ہو جاتی ہیں۔ لیکن اب ان کی فرمائش یہ ہے کہ میں انہیں کے ساتھ رہ جاؤں۔ یہاں خود افسانہ نگار کو منٹو کے افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کا سکھ پاگل یاد آ جاتا ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی سرحد کے قریب ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا تھا کہ میں ادھر بھی ہوں اور میں ادھر بھی ہوں اور پھر ساری رات کھڑا کھڑا وہیں مر گیا تھا۔

''اور جب میں واپس آنے لگا تو جل تھل آنکھیں میرے قدم تھام رہی تھیں اور غم میں ڈوبے چہرے میری راہوں میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن میں نے کہا کہ مجھے نہ روکو کہ میں ادھر ہوں۔

پر دوسرے ہی لمحے میں نے چونک کر کہا ---. نہیں میں ادھر بھی تو ہوں۔ کسی دیوانے نے اپنی ٹانگیں تقسیم کر کے بجھی بجھی آنکھوں سے یہ سوال کیا تھا کہ میں ادھر

ہوں میں ادھر ہوں تو آخر میں کدھر ہوں؟۔''

(روشنائی کی کشتیاں/ احمد یوسف۔افسانہ''تلوار کا موسم''، ص ۹۷)

اس کے بعد وہ ضعیف العمر شخص ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بٹے ہوئے اور تقسیم شدہ خاندانوں کے متعلق سوچتا ہے کہ کیا عجیب زمانہ آ گیا ہے کہ سگے بھائی، سگے چچازاد بھائی، کسی کو کسی کی کوئی خبر نہیں۔ایک بے خبری کا دور ہے۔ چچازاد بھائی پاکستان میں چل بسے۔بس ایک تار آ گیا۔فلاں لڑکے کی شادی ہوئی ایک تار آ گیا۔ یہ زبردست انسانی ٹریجڈی ہے کہ آپسی رشتے، خون کے رشتے چشم زدن میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔ بوڑھے کو اس کا بڑا غم ہے اور یقیناً اس کا غم ان لوگوں سے کہیں زیادہ ہے جو نوجوان ہیں یا بچے ہیں اور جنہوں نے مشترکہ خاندان کا آرام اور سکھ نہیں دیکھا ہے۔

المختصر یہ کہ اس ضعیف شخص کا غم ایک تو یہ ہے کہ پیداواری رشتے بدل گئے اور اب اس کے سامنے ایک بڑی کٹھن سی زندگی ہے کہ اس کے بچے خود کنواں کھودیں اور تمام پریشانیاں اٹھانے کے بعد اپنی تشنگی دور کریں۔ یہ آزادی کے بعد کی صورتحال ہے۔ دوسرا غم ملک کی تقسیم کا ہے کہ اپنے بھائی، چچیرے بھائی اور تمام ایسے لوگ کثیر تعداد میں ہجرت کر گئے جن سے خون کا رشتہ تھا اور اب عالم یہ ہے کہ غمی میں اور شادی میں محض رسمی طور پر ایک تار آ جاتا ہے کہ فلاں کی موت ہوگئی یا فلاں لڑکی یا لڑکے کی شادی ہونے والی ہے:

''انہیں سنبھال کر رکھو کہ یہ ایک جلے شہر کی راکھ ہیں۔اور کچھ نہیں رہنے پر راکھ بھی مقدس ہو جاتی ہے۔

میرا تو جیسے سارا، اگلا پچھلا وجود ان کاغذوں کے جسم میں سمٹ آیا ہے۔

اف میرے خدا ....کتنی روشنی ہے

....

.... کتنی تاریکی ہے

....

یوں لگتا ہے جیسے دل کے تولئے کو کسی نے گہرے پانی سے برآمد کر کے بڑی بے دردی سے نچوڑ دیا ہے۔''

(روشنائی کی کشتیاں/ احمد یوسف۔افسانہ۔''تلوار کا موسم''، ص ۱۰۱)

متذکرہ افسانہ سے روبرو ہوا جا سکے، اس خیال کے پیش نظر اسے شمولیت دی جا رہی ہے۔

تلوار کا موسم

(افسانوی مجموعہ 'روشنائی کی کشتیاں' سے ایک منتخب ڈرامہ)

آج پھر یہ تلوار خون میں لت پت دکھائی دے رہی ہے۔

اس کی سرد طبعی، اس کی خون آشامی۔وقت اور تلوار کے مزاج میں کتنی یکسانیت ہے۔

یہ شہنائیاں، یہ شور، یہ اوپر تلے بچّے ---

یہ اجاڑپن، یہ ویرانی، یہ دل کی بربادی ---

دبے پاؤں کسی نے وقت کی قبا ہی بدل دی۔اور یہ جو قبا ہے بے حد تنگ ہے، جگہ جگہ سے مسکی ہوئی ہے۔

کتنے ہی مہ و سال صفیں بنائے، ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ان ہی گزرے ہوئے ساتھیوں کی قربت میں سکون بھی ملتا ہے، ان ہی رفیقوں کے دم سے انتشار قلب بھی نصیب ہوتا ہے۔

یہ سامنے ایک رفیق کی کتاب کھلی ہے جو خود کو ورق ورق کھولتی جاتی ہے۔

تب یہ تلوار کہاں تھی؟---

ایک روشن مینار، دوسرا روشن مینار اور پھر کلیم کی شادی تو ایسا روشن مینار بن گئی ہے جس کے سامنے سبھی مینار بُجھ سے گئے۔

اس کے بعد ہی تو جانے کہاں سے یہ تلوار آ ٹپکی۔

دل میں چراغ جلتے ہیں تو گھر اُجالا ہو جاتا ہے، دل میں وسعت ہوتی ہے تو گھر کا دامن پھیل جاتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس مکان میں اتنے لوگ آ کیسے جاتے تھے۔دونوں بھائیوں کا بھرا پورا کنبہ۔ چچازاد بھائی بہنوں کا خاندان، ماموں زاد بھائی بہنوں کا خاندان، ان کے توسط سے بہت سارے لوگ۔ایک بڑی سی برادری ---اور یہ سلسلہ مہینوں سے چلتا رہتا اور مہینوں بعد تک جاری رہتا ---

ہمارے وقتوں میں لڑکوں کو بھی ہفتوں پہلے سے مانجھے بیٹھا دیا جاتا تھا، اب تو لڑکیاں بھی تین

دن سے زیادہ ماتھے نہیں بیٹھتیں ۔۔۔

آخر وہ بساط کہاں گئی جس کی صف آرائی ہم کرتے تھے؟۔۔۔

زندگی نے رنگ کب نہیں بدلے لیکن کوئی اس طرح رنگ بدلتا ہے۔؟

روشنیاں اب بھی ہوتی ہیں، گیت رنگ اب بھی ہوتے ہیں۔ قہقہے اب بھی بلند ہوتے ہیں، لیکن جیسے روشنیوں کے دل سونے ہوگئے ہیں، گیت کے بول کے دم پھول جاتے ہیں اور قہقہوں کے سینے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

ہفتوں پہلے سے رسمیں شروع ہوجاتی تھیں۔ رت جگے۔۔۔شامیانہ بندی گلگلے پکانے کی رسم ۔۔۔

ہر ہر موقعے پر کارندوں کو نچھاوریں دی جاتی تھیں ۔۔۔

دستر خوان کی وسعت مہینوں یکساں رہتی تھی۔

تب شادی کا گھر، شادی کا گھر معلوم ہوتا تھا۔ اوراب، اوراب ۔۔۔

اب تو بنئے کے یہاں سے غلّے خریدنے کا سلسلہ چل نکلا ہے۔

....

غلّے کی کوٹھیوں کے مُنھ کھلے ہیں۔ گاؤں سے غلّے کی بیل گاڑیاں آرہی ہیں۔

رام۔۔۔اے۔۔۔رام۔

دو۔۔۔اِی۔۔۔دو۔

کوٹھیوں کے پنجر میں نے توڑ وادئے کہ ان کے خالی سینے سے بڑی بھیانک اور دل خراش آوازیں نکلتی تھیں۔

رام ۔۔۔اے ۔۔۔رام

دو ۔۔۔ای ۔۔۔دو

وقت لاکھ ستم ڈھاتا لیکن یہ تلوار تو نہ چھوڑ جاتا۔

جب پہلی بار یہ تلوار چلی تو سارا منظر لہولہان ہوگیا تھا، اور کتنے ہی لوگ اس منظر سے نکل کر دوسرے منظر میں جا بسے تھے، لیکن اس دور دور تک پھیلے ہوئے 'کل' کو کس نے دیکھا تھا، اور کب یہ سوچا تھا کہ یہ تلوار ایک دن اس کی اپنی چھت تلے بھی آ ٹپکے گی۔

یہ تلوار جو ہر لحظہ زخموں پر ایک نیا وار کردیتی تھی، انھیں کسی طرح بھرنے ہی نہیں دیتی تھی۔

طالب کے متعلق خبر ملی تو یوں محسوس ہوا، جیسے کسی نے دل کی کھڑی فصل کو آگ لگادی ہو ۔۔۔میرا ماں جائی۔۔۔میرے سامنے بڑھا، پڑھا لکھا۔۔۔شادی ہوئی۔ بال بچے، نواسے ۔۔۔کیا کیا معرکے سر کئے اُس نے زندگی میں تجارت کو کتنا فروغ دیا۔

(لیکن خبر کب ہوئی جب مرنے والا منوں مٹی تلے آرام سے سو چکا تھا۔ طالب کی موت اگر یہاں ہوتی تو؟ ۔۔۔شعلے ضرور بلند ہوتے، قیامت ضرور بپا ہوتی۔ لیکن آگ پھر ٹھنڈی پڑ جاتی۔ دل دھیرے دھیرے چل کر سکون کی منزل پر پہنچ جاتا۔ لیکن اس عالم میں تو آگ ہی آگ تھی۔ جلن ہی جلن تھی۔ محرومی اور اضطراب ۔۔۔)

اور تب ایک قافلہ تیار ہوا۔ جس میں مَیں اکیلا تھا۔

فارم ۔۔۔دفتر۔۔۔بھاگ دوڑ ۔۔۔اور پھر طویل مسافت کے سانپ ۔۔۔

لیکن یہ اکیلا قافلہ بھی پہنچا تو چھوٹی بھاوج اور بچوں نے اس طرح دیکھا، جیسے انھوں نے ایک ساتھ کئی منزلیں سر کر لی ہوں۔

ایک منزل غم کی ۔۔۔دوسری استعجاب کی ۔۔۔تیسری خوشی کی۔

لیکن اذیتیں اور گہری اذیتیں انھیں ہر منزل پر ملی ہوں گی۔

وہ آگئے۔

ان کے پیچھے۔

پر وہ آتو گئے کہ سنگ و آہن کے سینے کب پگھلتے ہیں۔

اور جب میں واپس آنے لگا تو جل تھل آنکھیں میرے قدم تھام رہی تھیں۔ اور غم میں ڈوبے چہرے میری راہوں میں آکھڑے ہوئے تھے۔ لیکن میں نے کہا کہ 'مجھے نہ روکو کہ میں اُدھر ہوں'۔

پر دوسرے ہی لمحے میں نے چونک کر کہا۔ 'نہیں میں ادھر بھی تو ہوں'

کسی دیوانے نے اپنی ٹانگیں تقسیم کر کے بُجھی بُجھی آنکھوں سے یہ سوال کیا تھا کہ میں ادھر ہوں، میں اُدھر ہوں تو آخر میں کدھر ہوں؟۔

لیکن لہو میں ڈوبی ہوئی تلوار کچھ بھی تو نہیں بتا سکی تھی۔

تب طالب کے بڑے لڑکے کی شادی میں طالب کی دولہن کا خط آیا۔

''بھائی جان اب آپ ہی بچوں کے سرپرست ہیں آپ کا آنا بےحد ضروری ہے۔''

یہ حقیقت تھی کہ میرا جانا بےحد ضروری تھا۔لیکن 'بےحد ضروری' جیسی کوئی شے تلوار کے سائے میں کس طرح پھل پھول سکتی ہے؟

دفتری جھگڑے اور بھاگ دوڑ ـــ میں نے آخر تنگ آ کر سلیم کو بھیج دیا۔

لیکن نہیں جانے سے میرے دل پر کتنے وار ہوئے ـــ کتنے ستم ٹوٹے میرے دل پر یہ کون جانتا ہے۔مصیبت تو ساری یہ ہے کہ دل کے زخم ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے ہیں۔

شکایتیں بہت ہوئیں۔

لیکن کسے یہ خبر تھی کہ کوئی دم میں اس سے بھی زیادہ بھیانک دنوں کے عفریت بس آیا ہی چاہتے ہیں۔

آج کل بڑے بڑے جھنڈے، باجے گاجے اور نعروں کے دوش پر انقلاب کا شور بلند ہوتا ہے۔لیکن انقلاب تو ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔ان انگلیوں نے محسوس کیا ہے اور اس دل نے جھیلا ہے۔انقلاب انقلاب۔سراسر جھک مارتے ہیں۔

اور ان دنوں کے سنگ و آہن کی دیواریں قیامت کی گرمیوں سے پھنک رہی تھیں، ہفتوں بعد ایک بھولا بھٹکا تار آ پہنچا۔

یا خدا اگر روز روز بجلیاں گرتی رہیں تو بجلیوں کا یہ کھیل بھی بےوقعت ہو جائے گا۔

عامر کتنے چھوٹے تھے مجھ سے ـــ میرے چچازاد بھائی ـــ بس چل بسے۔

کب اور کیسے؟ ـــ کوئی کس سے پوچھے ـــ کسے آواز دے؟

کہ ساری آوازیں تو صدا بہ صحرا ہو چکی ہیں۔شاید ہم روتے بسورتے، دامن سے آنکھیں پونچھتے ایسے گھنے جنگل میں آ گھرے ہیں، جہاں نہ دن کا اُجالا پہنچتا ہے، نہ رات کا ماہتاب اُترتا ہے۔جہاں مشعلیں بےکار جاتی ہیں اور جہاں دل کی روشنیاں جسم کی قید سے آگے نہیں بڑھتیں۔

تاریخ بنانے والوں سے کوئی یہ پوچھے کہ یہ جو تاریخیں مٹی میں دبائی جا رہی ہیں؟

واسم نے لکھا تھا ـــ بھائی صاحب وہاں تاتاری یورشیں زوروں پر ہیں۔

آپ تپتی ہوئی ریت کے صحرا سے نکل کھڑے ہوں کہ یہاں بڑی گھنی چھاؤں ہے۔ٹھنڈے

پانی کا چشمہ ہے اور ہوائیں مسحور کن نغمے بکھیرتی ہیں۔

لیکن چاروں اور بھیانک سیلاب ہے اور کف آلودہ تھپیڑے دندناتے ہوئے حویلی کے اندر گھُس آئے ہیں۔ایسے میں میں تو اس ڈوبتی ہوئی حویلی کی ایک کڑی میں لٹک گیا ہوں، یا شاید خود ہی کڑی بن گیا ہوں۔

اس عالم میں مَیں واسم کو کیا لکھتا؟۔

اور جب پچھلے دنوں میرے سرجن نے ایک بڑے آپریشن کا فیصلہ کیا تو میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔کوئی بھی تو نہیں تھا۔سمجھ میں نہیں آتا کہ 'کل' کے شہر کو آخر کس نے مِسمار کیا؟۔اس آج نے؟ ـــ اس لٹکتی ہوئی تلوار نے؟ ـــ

تب ایک جہانیان جہاں گشت نے یہ خبر دی کہ واسم کو بھی پچھلے دنوں اس نوع کا ایک آپریشن ہوا تھا۔

واسم کو؟ ـــ

یعنی میرے واسم کو؟

اور مجھے خبر تک نہیں۔

لیکن یہ تو بےخبری کا دور ہے۔بس خبر ہے تو اس حد تک کہ ہماری سانسیں چل رہی ہیں اور ہم نے ایک اور زندہ ساعت کو سر کر لیا ہے۔

تلوار کے سائے میں زندہ ساعتیں!

سَاجدہ کے کتنے بچے ہیں؟ ـــ

'مجھے معلوم نہیں'۔

'زبیر کی شادی ہو چکی'؟ ـــ

'کارڈ تو شاید پچھلے دنوں آیا تھا' ـــ

ہم نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا ـــ

زندگی کے ان بائیس برسوں نے میرے پچاس برسوں کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔اگر یہ بائیس سال نہ آتے تو؟

موت میں بھی ایک لذت کا احساس ہوتا۔

اوراب تو بس ایک حال کا نقطہ ہے جو نگاہوں کے دائرے میں ہے اور باقی تاریکی ہی تاریکی ---

میراثنیں اونچے سروں میں گا رہی ہیں۔

شل ہوئے پاؤں رہ عشق میں منزل کے قریب

لیکن یہاں تو آبلہ پائی مقدر بن چکی ہے۔ منزل قریب بھی ہے، منزل دور بھی ہے ---

کون سی منزل؟ ---- کون سا جادہ؟

گیت --- روشنیاں --- رونقیں --- سب کچھ ہیں مگر وہ کہاں ہیں ؟ ---

ہم کہاں ہیں؟ ---

ٹہنی سے لپٹا ایک تنہا سوکھا پتہ۔ نسیں اُبھر آئی ہیں۔ چکنی پرت جھڑ کر جالیاں سی نکل آئی ہیں۔

سارا کلوروفل، ساری زندگی کسی نے نچوڑ کر رکھ لی ہے اور اب کوئی آن میں ----

بس ایک تلوار ہے جو تازہ دم ہے، خون آلودہ ہے ----

'کوئی نہیں آیا ---- کوئی نہیں آیا' ----

'یہ بُنی کا ہے، یہ سرفراز کا اور یہ سہیل کا' ----

تین تار ---- ایسے میں کہ ایک تلوار جانے کب سے سروں پر لٹک رہی ہے۔

غنیمت ہیں یہ بھی غنیمت ہیں۔

اُنھیں سنبھال کر رکھو کہ یہ ایک جلے شہر کی راکھ ہیں اور کچھ نہیں رہنے پر راکھ بھی مقدس ہو جاتی ہے۔

میرا تو جیسے سارا اگلا پچھلا وجود ان کاغذوں کے جسم میں سمٹ آیا ہے۔

اُف میرے خدا ---- کتنی روشنی ہے ----

---- کتنی تاریکی ہے ----

یوں لگتا ہے جیسے دل کے تولئے کو کسی نے گہرے پانی سے برآمد کر کے بڑی بے دردی سے نچوڑ دیا ہے۔

اور یہ بچے کس قدر شور مچا رہے ہیں ----

❋

افسانوی مجموعہ 'آگ کے ہمسائے' :

احمد یوسف کے افسانوی مجموعہ 'آگ کے ہم سائے' کا اشاعتی سال ۱۹۸۰ء ہے۔ یہ کل اکیس افسانوں پر مشتمل ہے۔ مشمولہ افسانوں کے عنوانات ہیں: 'چراغ کشتہ'، 'ظلمت کدے میں'، 'ڈوبتی اُبھرتی شام'، 'نقش نا تمام'، 'دریا ایک رات کا'، 'کاغذ آتش زدہ'، 'قصہ حجام کے ساتویں بھائی کا'، 'خبر دشت و بیاباں کی'، 'اک جہاں زندانیوں کا'، 'بدلتے تیوروں کا سورج'، 'قیامت کا ایک دن'، 'اونچی اونچی عمارتیں'، 'اک منظر سامنے کا'، 'مطلع'، 'ورثہ'، 'روشنی روشنی'، 'خط منحنی' 'آگ کے ہمسائے'، 'کھنڈروں میں بسے لوگ'، 'رکی ہوئی گھڑی' اور 'وہ ایک شخص'۔

مجموعہ کے متذکرہ افسانوں میں ''چراغ کُشتہ'' ایک پیرانہ سال گھر کے ملازم کے متعلق ہے۔ ''چراغ کُشتہ'' سے یہاں یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ جس طرح چراغ رات کے آخری سرے پر نڈھال نڈھال سا، بجھا بجھا سا نظر آنے لگتا ہے اسی طرح ضعیف العمری میں وہ بوڑھا گھر کا ملازم بھی تھکا تھکا سا اور مضمحل سا دکھائی دیتا ہے۔

افسانہ ڈائرکٹ Narration میں ہے اور اس افسانے میں افسانہ نگار نے اس تکنیک کا استعمال کیا ہے کہ تمام باتیں افسانے کا Narrator یعنی وہ ضعیف العمر ملازم خود ہی بیان کرتا ہے اور اس کا مخاطب نوجوان نہ تو اس کے بیان کو کہیں کاٹتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی تبصرہ کرتا ہے۔

یہ ایک ایسی خود کلامی کی کیفیت ہے جس میں وہ بوڑھا اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کا ایک نوجوان ساتھی بھی ہے جو شروع سے آخر تک خاموش رہتا ہے۔ اسے ہم Soliloquy بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہ ایسا کھاتے پیتے لوگوں کا ایک گھرانہ ہے جس میں اگر کبھی زمینداری رہی بھی ہوگی تو اب وہ اس گھرانے کا ذریعہ معاش نہیں ہے بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اور وہاں سے رزق حاصل کرتے ہیں۔

بوڑھا پرانے پروفیسر کا ملازم تھا۔ ان کا ولایت جانا، وہاں سے واپس آنا، اسے اپنا ایک نیا

سوٹ دے دینا نیز انکی فیاضی اور سیر چشمی سب کچھ بوڑھے کو یاد ہے اور وہ اس آئے ہوئے نوجوان کو سنارہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب وہ ولایت جانے لگے تھے تو اپنے دونوں لڑکوں کو میرے سپرد کر گئے تھے:

''یہ مزاج تھا اگلے لوگوں کا ----اللہ اللہ ----اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔''

(آگ کے ہم سائے/احمد یوسف،''چراغ کشتہ''،ص۔۴)

بوڑھا پھر اپنے آقا کی تصویر نوجوان کو دکھاتا ہے اور اس کوٹھی کے متعلق بتاتا ہے:

''یہ کوٹھی پروفیسر صاحب نے ولایت سے واپس آکر بنوائی تھی۔ یہاں پہلے ایک پرانے طرز کی عمارت تھی۔ ہر بڑا آدمی اپنی تعمیر آپ کرتا ہے۔''

(آگ کے ہم سائے،احمد یوسف،''چراغ کشتہ''،ص۔۵)

اس کے بعد وہ ان لوگوں کے متعلق بتاتا ہے جو پروفیسر صاحب کے دوست، ہم خیال اور ہم جلیس تھے، وہ سبھوں کی فرداً فرداً تعریف کرتا ہے۔ پھر انکی داد و دہش کے قصے سناتا ہے۔ انکے جمالیاتی احساس کی بات کرتا ہے۔ پھول کے تخت اور ہرے بھرے چمن کا ذکر کرتا ہے۔

اس کے بعد بوڑھا ان کے لڑکوں کے قصے سناتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ سب بھی بڑے باپ کے بیٹے ہیں اور اچھے ہیں۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ میرے یوں تو بال بچے سبھی ہیں مگر بڑھاپے میں کون کس کو پوچھتا ہے اس کی بیوی پروفیسر صاحب کے قبرستان میں مدفون ہے۔ اس کے بعد وہ پروفیسر صاحب کے پوتے حسام الدین کا ذکر چھیڑ دیتا ہے جو ان پرانے لوگوں کی یادگار ہیں اور خود بھی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

وہ انکا بڑا پاس رکھتا ہے اور یہیں سے اب بھی اسے سب کچھ ملتا ہے رہنا، کھانا، پینا، کپڑا اور بیس روپئے ماہوار۔

کسی کے آگے اسے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا ہے۔

اس کے بعد وہ زمانے کے متعلق کہتا ہے کہ:

''زمانے کو قرار نہیں ہے۔ ان آنکھوں نے کیسے کیسے انقلابات دیکھے ہیں۔ اور آج

بھی 'لوگ انقلاب زندہ باد' کے نعرے لگاتے ہیں۔ میاں جو دن آرہے ہیں وہ اور بھی سخت ہونگے۔ قیامت کے آثار ہیں۔''

(آگ کے ہم سائے،احمد یوسف،''چراغ کشتہ''،ص۔۵)

اس کے بعد حسام الدین کے متعلق کہتا ہے کہ ابھی وہ آئے نہیں ہیں اور یہ کہ آنے والا یقینی طور پر حسام الدین سے ہی ملنے آیا ہوگا۔

پھر وہ آنے والے کی تعریف کرتا ہے اس کی خاندانی وجاہت کی باتیں کرتا ہے اور باتوں ہی باتوں میں ان کے آگے دست سوال بڑھا دیتا ہے:

''اچھا میاں اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو کچھ عرض کروں۔ بڑی سخت ضرورت آپڑی ہے، آپ کچھ مدد کریں تو عین نوازش ہوگی۔ شہر میں سینکڑوں رئیس پڑے ہیں، مگر میں آج تک کسی کے در پر نہیں گیا۔ آپ پر تو حق ہے، اپنے بچے جو ٹھہرے۔''

(آگ کے ہم سائے/احمد یوسف،''چراغ کشتہ''،ص۔۵)

اس کے بعد وہ پیسے ملنے پر انہیں دعائیں دیتا ہے:

''خوش رہئے میاں یہ آپ نے دو روپئے نہیں دیئے ہیں دو ہزار روپئے دیئے ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔''

(آگ کے ہم سائے/احمد یوسف،''چراغ کشتہ''،ص۔۶)

اس طرح اس افسانے میں چار پانچ کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو وہ بوڑھا قصہ گو ہے جو ایک خاندان کی پوری تاریخ بیان کرتا ہے دوسرے Fall Back میں وہ پروفیسر صاحب ہیں، ان کے احباب ہیں، ان کے دولڑکے ہیں، ان کے ایک پوتے ہیں اور پھر آخر میں وہ نوجوان ہے جسے ہم کہانی کے سیاق وسباق سے باآسانی Locate کر لیتے ہیں کہ وہ حسام الدین سے ملنے آیا ہے۔ بوڑھا اسے جانتا ہے کیونکہ وہ نہ صرف اس کی تعریفیں کر رہا ہے بلکہ اس کے خاندان کی بھی تعریفیں کر رہا ہے اور اس طرح جیسے وہ ان سب سے اچھی طرح سے واقف ہے وہ نوجوان کے بزرگوں کو بھی جانتا ہے۔ نوجوان یقینی طور پر اس گھر میں بارہا آچکا ہوگا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ بوڑھا اسے اور اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتا ہے لیکن بوڑھے کی ہشیاری دیکھئے کہ وہ اس طور پر اس کے سامنے اس کوٹھی کی تاریخ اور اس

خاندان کا ذکر اور پروفیسر صاحب کا حال سناتا ہے جیسے وہ نوجوان ان باتوں سے بالکل ہی بے خبر تھا۔

یہ ایک انداز ہے ان لوگوں کا جو اس سوسائٹی کے پروردہ تھے۔ وہ واقعات کو Twist کرانا بھی جانتا ہے اور انہیں بتدریج آگے بڑھانا بھی جانتا ہے۔

وہ پہلے پروفیسر کا ذکر کرتا ہے۔ پھر ان کے بیٹوں کا ذکر کرتا ہے۔ پھر ان کے پوتے کا قصہ سناتا ہے اور بالآخر آنے والے نوجوان کی بھی مدح خوانیاں کرتا ہے۔

یعنی زینہ بہ زینہ وہ نیچے اترتا جاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ دست سوال بڑھانے کے لئے ایک فضا تیار کر رہا ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے بڑی کامیاب فضا بندی کی ہے۔

گویا کہ اس افسانے میں افسانہ نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ گھر کا ملازم اور ایسا ملازم جو اپنے آقاؤں سے بہت زیادہ Attached رہا ہو وہ خود بھی شائستہ مزاج اور تہذیب یافتہ ہو جاتا ہے۔

بوڑھا چھوٹتے ہی نوجوان سے کہہ سکتا تھا کہ میاں، کچھ پیسے دیجئے بہت سخت ضرورت ہے۔

لیکن اس نے اس کام کے لئے ایک لمبی چوڑی کہانی سنائی جس میں وہ خود بھی ایک کردار تھا۔

متذکرہ افسانہ ملاحظہ میں آسکے، اسی غرض سے اسے شمولیت دی جارہی ہے۔

❋

چراغ کشتہ

(افسانوی مجموعہ آگ کے پیمانے سے ایک منتخب افسانہ)

غالباً خاکسار کو آپ نے پہچانا نہیں۔ سچ فرمایا آپ نے۔ بہت دن ہو گئے دیکھے ہوئے۔ بچپن میں تو آپ حسام الدین سے ملنے ہر دوسرے تیسرے دن آیا کرتے تھے۔ دراصل بچوں کی صحبت میں میرا بہت دل لگتا ہے کل بھی لگتا تھا اور آج بھی لگتا ہے اس لئے جو بچے آج جوان ہو گئے انھیں بھی پہچانتا ہوں اور جو بچے کل جوان ہوئے تھے اور آج ادھیڑ ہو چکے ہیں انھیں بھی پہچانتا ہوں۔ اس گھر کی تین پشتوں کو گود میں کھلا چکا ہوں۔

یہ حسام الدین کا بچہ ہے۔ بیٹے یہ چچا ہیں تمہارے انھیں سلام کرو۔ میری عمر کے متعلق دریافت کیا آپ نے۔ یہی کوئی ستر پچھتّر کے لگ بھگ ہوگی۔ میاں اگلے وقتوں کا کھایا پیا کام آرہا ہے۔ ورنہ وہ غذا کسے نصیب۔۔۔ اگلے وقتوں کی باتیں تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی ہیں ۔۔۔ کیا آسودگی کا زمانہ تھا ۔۔۔ ہر چیز میں برکت تھی ۔۔۔ اب تو جیسے برکت ہی ختم ہوگئی ہے۔ سچ پوچھئے تو لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف تھا۔ اس لئے ملاوٹ کا بیوپار ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور آج جو یہ نئی نئی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں میرے خیال میں تو میاں یہ سب ملاوٹ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ہمارے وقتوں میں ہر چیز خالص تھی۔ لیکن آج تو میاں یہ عالم ہے کہ بغیر ملاوٹ کے کوئی بیوپار ہی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی بھی اب خالص نہیں ملتا ہے۔ آپ آج کے آدمی ہیں آپ کو یہ باتیں ناگوار گذریں گی لیکن حقیقت تو کچھ ایسی ہی ہے میاں۔

حسام الدین کالج گئے ہوئے ہیں۔۔۔ آپ آرام سے بیٹھیں آپ ہی کا گھر ہے۔ کیا وقت ہوا ہے آپ کی گھڑی میں۔ بس اب ان کے آنے کا وقت ہو ہی چلا۔

آپ نے تو اس کوٹھی کے اچھے دن دیکھے ہیں ۔۔۔ میاں چونکنے کی بات نہیں ہے۔ یہ سب قدرت کا نظام ہے، ہم آپ تو مجبور محض ہیں۔

پروفیسر صاحب تو یاد ہوں گے آپ کو ۔۔۔ جی ہاں پروفیسر حنیف ہی کے متعلق عرض کر رہا

ہوں ۔۔۔ کیا وضعدار آدمی تھے ۔۔۔ کیا شان بان تھی ان کی ۔۔۔ بس یوں سمجھئے کہ اگلی شرافت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ میری حیثیت کیا تھی میاں ۔۔۔ معمولی خدمتگار تھا۔ ان کی جوتیوں کی خاک تھا۔ پر اُن کی زندگی میں میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں ایک معمولی خدمتگار رہوں۔ علم انسان کو بہت بلند کر دیتا ہے میاں۔۔۔ اتنا بلند کہ وہ ہر چیز کو بلند دیکھنے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔

ارے میاں آپ تو کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ معمولی سا آدمی ہوں۔ معمولی سی باتیں کرتا ہوں۔ فلسفہ کہاں؟ ۔۔۔ یہ سب پروفیسر صاحب کی دین ہے۔ آپ جیسے معزز لوگوں سے دو دو باتیں کر لیتا ہوں ۔۔۔ شرفاء کی مجلس کے آداب جانتا ہوں۔ جی ہاں وہ تو دنیا کو بہت کچھ دے کر گئے، پر ہم کیا دے کر جائیں گے میاں ۔۔۔ ہمارے پاس کیا دھرا ہے۔

دس سال کی عمر تھی میری جب میں یہاں آیا تھا میری والدہ نے پروفیسر صاحب کو گود میں کھلایا تھا۔ اسی سال میرے والد کا انتقال ہوا تھا۔ جی وہ نواب امتیاز حسین صاحب کے یہاں خدمتگار تھے۔ آپ نے تو 'امتیاز منزل' دیکھی ہوگی ۔۔۔ بڑا دربار تھا صاحب وہ بھی ۔۔۔ ہاں اب تو پہلی سی بات کہیں نہیں رہی۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ مجھے یہیں لے آئیں۔ ہر چند نواب صاحب نے کہا بھی کہ وہ مجھے والد کی جگہ پر بحال کر لیں گے۔ وہ بھی بڑے مخیّر تھے۔ لیکن والدہ نہ مانیں۔ میری قسمت اچھی تھی کہ یہاں آ گیا اور بڑے باکمالوں کی صحبت میں زندگی گزار دی۔

پروفیسر صاحب بس یوں سمجھئے کہ مجھ سے کوئی آٹھ دس سال بڑے ہوں گے۔ تھے تو میرے آقا۔ لیکن برتاؤ بالکل بڑے بھائیوں جیسا تھا چنانچہ لطیف میاں اور شریف میاں نے مجھے ہمیشہ 'چچا' ہی کہا۔

اجی میاں ولایت جانے لگے تو لطیف میاں اور شریف میاں دونوں بہت چھوٹے تھے، بس دو چار سال کا فرق ہوگا دونوں بھائیوں میں ۔۔۔ ان دونوں کو میرے سپرد کر گئے تھے ۔۔۔ یہ مزاج تھا اگلے لوگوں کا ۔۔۔ اللہ اللہ ۔۔۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

یہ تصویر ولایت میں کھنچوائی تھی۔ کیا وجیہہ آدمی تھے۔ کیا بارعب چہرہ پایا تھا۔ نور ٹپکتا تھا نور اور چہرہ تو میاں دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ میرے محسن، میرے آقا۔ آپ کی بدولت میں نے کیسے کیسے عیش کئے ۔۔۔ جب بھی پروفیسر صاحب کا ذکر آتا ہے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ چلے گئے جن کی دنیا کو ضرورت تھی اور ہم رہ گئے جو دنیا کے لئے ایک بے ضرورت سی شئے ہیں۔ فطرت کا مذاق ہے یہ بھی۔

اب کیا جسم رہے گا۔ جوانی میں بڑا کس بل تھا۔ اب تو نہ وہ غذا ہے نہ وہ پانی ہے۔ جی ہاں پانی میں بھی بڑا فرق آ گیا ہے۔

جو کچھ کھانے کو ملتا ہے کھا لیتا ہوں اور جو کچھ پینے کو ملتا ہے پی لیتا ہوں۔ یہ بھی خدا کی مہربانی ہے۔ سارے شوق تو میاں برسوں پیچھے چھوٹ گئے۔ ارے کیا پوچھتے ہیں۔۔۔ اب تو دیسی کپڑوں کا دَور دَورہ ہے، میری جوانی کے دنوں میں تو بس باہر ہی کے کپڑے چلتے تھے۔ کوئی بیس سال کی عمر ہو گی میری، جب پروفیسر صاحب ولایت سے واپس آئے تھے۔ میں نے سوال کیا میرے لئے کیا لائے ہیں۔ کہنے لگے جو مانگو حاضر ہے۔ میں نے للچائی نظروں سے ان کے سوٹ کو دیکھا ۔۔۔ میاں سچ کہتا ہوں بہترین ولایت کا سلا سوٹ اسی وقت اُتار کر دے دیا۔ حالانکہ بڑے خوش پوشاک آدمی تھے اور کپڑوں سے تو جیسے عشق کرتے تھے۔ لیکن میں کہوں اور وہ نہ دیں۔ زندگی بھر انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ میرا دل میلا نہ ہو۔ دراصل میری ماں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے خیال رکھنا۔ بڑی عزت کرتے تھے وہ ان کی۔ ان کے ولایت جانے سے کوئی دو سال پہلے مری تھیں۔ میاں یہ اگلے لوگوں کی باتیں تھیں جو اُن کے ساتھ چلی گئیں۔ میری والدہ سے انھوں نے جو وعدہ کیا تھا اُسے زندگی بھر نباہنے کی کوشش کی۔ اب ان باتوں کو کون باور کرے گا۔

یہ کوٹھی پروفیسر صاحب نے ولایت سے واپس آکر بنوائی تھی۔ یہاں پہلے ایک پرانے طرز کی عمارت تھی۔ ہر بڑا آدمی اپنی تعمیر آپ کرتا ہے۔ یہ نشست گاہ پروفیسر صاحب کے زمانے میں دیکھنے کی چیز تھی۔ بہت سارے نوادرات جمع کر رکھے تھے انھوں نے۔ کچھ چیزیں لطیف میاں کے یہاں ہیں کچھ شریف میاں کے یہاں اور کچھ یہیں مقفّل کر دی گئی ہیں۔ ارے میاں یہاں میں نے ایسی ایسی جلیل القدر ہستیوں کو زانوئے ادب تہہ کرتے دیکھا ہے کہ حیرت ہوتی تھی ۔۔۔ یوں سمجھئے کہ یہاں سے علم کا ایک چشمہ جاری تھا۔ پیسوں کی کمی نہیں تھی ۔۔۔ حاکم قدر دان تھا اور ہر شخص کے مرتبے کو پہچانتا تھا۔ ایسا نادر روزگار روز روز تو پیدا ہونے سے رہا ۔۔۔ خوب کمایا اور خوب خرچ کیا۔۔۔ مجھ سے تو کچھ چھپا نہیں تھا میاں ۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے دم سے کتنوں کی پرورش ہوتی تھی۔ یتیموں اور بیواؤں کے لئے تو ہر مہینے کی تنخواہ سے ایک اچھی خاصی رقم نکال لیتے تھے اور یہی خاکسار سبھوں کو پہنچاتا تھا۔ کمال تو یہ ہے میاں کہ لطیف میاں اور شریف میاں کو بھی آج تک ان باتوں کی خبر نہیں ہے۔ اللہ کی راہ پر خرچ کرتے تھے۔ نام

ونمود سے تو کوسوں دور بھاگتے تھے۔

پروفیسر صاحب کے زمانے میں کچھ نہ پوچھئے کیا عروج تھا اس کوٹھی کا۔ کتنے لوگ تھے یہاں۔ دراصل وہ پورے خاندان کو سمیٹ کر رکھنا جانتے تھے۔ ان کی زندگی میں سبھی ایک مرکز پر جمع تھے، لیکن ان کی آنکھ بند ہوتے ہی پورے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔۔۔۔ خاندان تو خاندان کے بزرگ سے قائم رہتا ہے۔ کیا عزّت تھی۔ کیا وقار تھا۔۔۔۔ سچ کہہ رہے ہیں زمانہ بھی بہت بدل گیا۔۔۔۔ یہ جو پھولوں کے تختے دیکھ رہے ہیں، انھیں کے ہاتھ کے لگائے ہوئے ہیں۔ خود بھی مجسم باغ و بہار تھے۔

پروفیسر صاحب خُلد آشیانی ہوگئے۔ میں بھی سفر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔

لطیف میاں وکالت کرتے ہیں ۔۔۔ شریف میاں پروفیسر ہیں۔ دونوں نے شہر چھوڑ دیا ۔۔۔ یہ جگہ تو اب ویران سی ہوتی جاتی ہے میاں۔

شریف میاں کے متعلق پوچھ رہے ہیں، کیا کہنے ہیں ان کے۔ بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ خود بھی کوئی دن میں باپ کے مرتبے پر پہنچ جائیں گے۔ بڑا نام ہے ان کا۔ کتابیں لکھتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا بچپن سے شوق ہے۔ پروفیسر صاحب تو انھیں کتابوں کا کیڑا کہا کرتے تھے۔ پڑھ پڑھ کر صحت خراب کر لی اپنی۔ مگر وہ بھی علم کے دریا ہیں۔ گود میں کھلایا ہے ان بچوں کو، اب تو ادھیڑ ہوگئے۔ جی ہاں کبھی کبھار تو آجاتے ہیں۔ لطیف میاں ہر خط میں بڑے اصرار سے بلاتے ہیں۔ شریف میاں بھی برابر کہتے رہتے ہیں کہ میرے یہاں آجاؤ۔ میاں اب اس بڑھاپے میں کہاں جائیں۔ اسی گھر میں جوان ہوئے، اسی میں ادھیڑ ہوئے، اسی میں بوڑھے ہوئے، اب تو میاں اس گھر سے مر ہی کر نکلیں گے۔ کیسی کیسی یادیں وابستہ ہیں اس گھر سے۔

جی ہاں۔۔۔۔ بال بچے سب ہی ہیں، مگر پیری میں کون ساتھ دیتا ہے۔ بڑا سہارا ہے اس گھر کا۔ میری بیوی کو مرے کوئی دس سال سے بھی زیادہ ہوگئے۔ یہ جو اس کوٹھی کی پشت پر پروفیسر صاحب کا آبائی قبرستان ہے، وہیں وہ نیک بخت مدفون ہے۔

میاں اب تو حسام الدین کی ذات بڑی غنیمت ہے۔ پروفیسر صاحب کے پوتوں میں خاندانی روایات کو کسی نہ کسی حد تک اسی نے قائم رکھا ہے۔ بڑا ہی سعادت مند لڑکا ہے۔ میرا تو بے حد لحاظ کرتا ہے۔ اب تو یہ سارا کارخانہ حسام الدین کے دم سے قائم ہے۔ ورنہ لطیف میاں کو آبائی مکان کی فکر ہے نہ شریف

میاں کو۔ بیچارے حسام الدین کی کالج میں نئی نئی ملازمت ہے۔ چھوٹی سی تنخواہ پاتا ہے۔ زمانہ ایسا سخت آگیا ہے کہ آدمی پیسے کھاتا ہے پیسے۔ لیکن حسام الدین نے گھر کو دوبارہ سنبھالنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اللہ اسے حیات دے۔ جی ہاں پروفیسر صاحب کا زمانہ اب کہاں؟ ۔۔۔ لیکن بیچارا کچھ نہ کچھ تو دادا کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ بیچارے نے میرے بیس روپے مقرر کر دیئے ہیں۔ کھانا ناشتہ بھی ملتا ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا ہوں۔ اللہ نے عزت سے گزار دی۔ تھوڑی سی زندگی رہ گئی ہے، دعا کیجئے کہ وہ بھی عزّت سے گزر جائے۔

زمانے کو قرار نہیں ہے ۔۔۔ ان آنکھوں نے کیسے کیسے انقلابات دیکھے ہیں۔ اور آج بھی لوگ ’انقلاب زندہ باد‘ کے نعرے لگاتے ہیں۔ میاں جو دن آرہے ہیں وہ اور بھی سخت ہوں گے۔ قیامت کے آثار ہیں۔

آپ شاید اکتا گئے۔ بس اب حسام الدین آہی چلے۔ میاں آپ حسام الدین کے دوست ہیں، پڑھے لکھے ہیں، عالی خاندان ہیں۔۔۔۔ جی ہاں بچپن سے جانتا ہوں آپ کو۔ اللہ نے بڑے مرتبے پر پہنچایا ہے، وہ اور ترقی دے گا۔ بس اپنا ہی سمجھ کر آپ کو یہ دُکھڑا سنا رہا تھا کہ ہم لوگ بھی فسانہ ہیں۔

آپ لوگوں کی ذات بڑی غنیمت ہے۔ پرانے لوگوں کو جانتے ہیں، پرانے رسم و رواج سے واقف ہیں، ورنہ میں آپ کو بتاؤں یہ جو تازہ بہ تازہ نسل آرہی ہے، بڑی ہی باغی اور سرکش ہے۔ اسے تو جیسے پچھلی بات کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں۔

اچھا میاں اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو کچھ عرض کروں۔ بڑی سخت ضرورت آپڑی ہے، آپ کچھ مدد کریں تو عین نوازش ہوگی۔ شہر میں سینکڑوں رئیس پڑے ہیں، مگر میں آج تک کسی کے در پر نہیں گیا۔ آپ پر تو حق ہے، اپنے بچے جو ٹھہرے۔

خوش رہیے میاں، یہ آپ نے دو روپے نہیں دیئے ہیں دو ہزار روپئے دیئے ہیں، خدا آپ کی عمر دراز کرے۔

❋

افسانوی مجموعہ '۲۴ گھنٹے کا شہر' :

احمد یوسف کا افسانوی مجموعہ '۲۴ گھنٹے کا شہر' ۱۹۸۴ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ یہ کُل بیس افسانوں پر مشتمل ہے۔ مشمولہ افسانوں کے عنوانات ہیں: 'ان کی تجربہ گاہ'، 'فرد'، 'کل کی شب'، 'صد ہزار قصّے'، 'دشت بہ دشت' 'کُو بہ کُو'، 'جلوس'، 'یہی آدمی یہی آدمی'، 'مکالمہ'، 'صورت ایک بے کیفی کی'، 'قربت کی دوری'، 'بستی ایک نئی ہے'، 'رشتہ'، 'آنے والا'، 'بلب ایک گزرگاہ کا'، 'کاروبار'، 'حالات'، 'اُترتی چڑھتی رونقیں'، '۲۴ گھنٹے کا شہر'، 'محبس' اور 'وقت رخصت'۔

مجموعہ کے متذکرہ افسانوں میں افسانہ ''صورت ایک بے کیفی کی'' ایک تجریدی افسانہ ہے جو ایک مقام پر علامتی بھی ہو جاتا ہے۔

ایک شخص کے پاس ایک ایسی تصویر ہے جو بے حد مہیب ہے اور اس کی آنکھیں بڑی خوفناک ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس تصویر میں کچھ ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جن سے وہ تصویر بہتر نظر آنے لگے اور وہ اسے گوارا کر سکے۔ تب وہ اپنے ایک آرٹسٹ دوست کو پکڑ کر لے آتا ہے کہ وہ اس تصویر کی ہولناکی کو ختم کر دے۔ آرٹسٹ بڑا مصروف آدمی تھا۔ وہ آتا، کچھ دیر کام کرتا، اور پھر سگریٹ پھونک کر گھر چل دیتا۔ لیکن ایک دن اس نے اعلان کیا کہ یہ تصویر سدھر گئی اور اب تم اسے دیکھو۔

افسانے کا واحد متکلم، جب اس تصویر کو دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں خوش وخرم آبادیوں کا گیت لہک رہا تھا۔ اس نے خوشی میں آرٹسٹ سے کہا:

''آرٹسٹ تم واقعی گریٹ ہو، تم نے بالآخر اس کے اندر کے شیطان کو نکال پھینکا۔''

('۲۴ گھنٹے کا شہر/ احمد یوسف، افسانہ ''صورت ایک بے کیفی کی''، ص ۴۸)

اس کے بعد 'میں' کے اچھے دن آ جاتے ہیں اور وہ خوش وخرم رہنے لگتا ہے اور تصویر بھی اس کی مرضی کے عین مطابق ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی یہ خوشی بہت ہی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ ایک دن جب اس

نے تصویر کی طرف دیکھا:

''اس کی آنکھوں میں پھر وہی چنگاریاں عود کر آئی تھیں، اس کے ماتھے پر پھر وہی صف در صف شکنیں کھڑی تھیں، اس کا پیرہن پھر اسی طرح سرخ ہو گیا تھا۔۔۔ اور اس کی آنکھیں اس چھری پر جمی تھیں جو سیبوں کے درمیان رکھی تھی۔''

(۲۴ گھنٹے کا شہر/ احمد یوسف، افسانہ ''صورت ایک بے کیفی کی''، ص ۴۹)

تبھی افسانے کا 'میں' چیخ اٹھتا ہے اور اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ آرٹسٹ آئے تو اس سے کہنا کہ یہ تصویر پھاڑ کر پھینک دے اور اس کی جگہ ایک نئی تصویر بنائے ۔۔۔۔ یہ تصویر کبھی نہیں سدھرے گی۔

یہ افسانہ جس کے متعلق میں نے ابتدائی سطروں میں کہا تھا کہ یہ تجریدی بھی ہے اور کہیں کہیں علامتی بھی ہو گیا ہے۔ افسانہ نگار کے مطابق تین کرداروں کے درمیان اس افسانے کے تانے بانے بنے جاتے ہیں۔ ایک افسانے کا واحد متکلم، دوسرا اس کا دوست آرٹسٹ اور تیسری اس کی بیوی۔ تصویر اس نظام کی علامت ہے جس کی جملہ خرابیوں کو دیکھ کر 'میں' سخت بیزار تھا اور جس پر وہ اپنے آرٹسٹ دوست سے یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک انقلابی سے یہ کہتا ہے کہ اس تصویر میں یا اس نظام میں ایسی تبدیلی لے آؤ کہ وہ بہتر دکھائی دینے لگے۔

آرٹسٹ یا انقلابی تھوڑی سی محنت کے بعد یہ کام کر دیتا ہے اور وہ تصویر واقعی اچھی دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے دیکھا کہ اس تصویر کا فرد پھر اسی طرح سرخ سرخ آنکھیں لئے اس چھری کو دیکھ رہا تھا جو سیبوں کے درمیان رکھی ہوئی تھی۔

یعنی یہ کہ پھر اس کے ارادے قتل وغارت گری کے ہونے لگے تھے۔ تب واحد متکلم کہتا ہے کہ اس تصویر کو پھاڑ کر از سر نو آرٹسٹ ایک تصویر بنائے۔

یہاں دراصل بات بنیادی تبدیلی کی ہے۔ یعنی جس نظام میں ہم بستے ہیں، اس قدر خراب اور فرسودہ ہو چکا ہے کہ اس میں ایک بنیادی تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ ورنہ تھوڑی بہت اصلاح کر دینے سے معاملات نہیں سدھریں گے اور یہ مسئلے کا کوئی دائمی حل بھی نہیں ہے۔ نظام، سسٹم یا صورتحال کے سلسلے میں افسانہ کے بالکل آغاز میں ہی افسانہ نگار نے علامتی انداز میں ایک قابل توجہ بات کہی ہے جو اقتباس کی

صورت پیش ہے:

'' آپ ہی سوچئے کہ صبح سے شام تک اگر آپ ایک ایسی تصویر دیکھتے رہیں کہ جس کی آنکھوں میں سیکڑوں من لکڑیوں کا جہنم روشن ہو۔ایک قدم آگے بڑھے اور اس کے لپکتے شعلوں نے آلیا۔جس کے چہرے پر ایسی مہیب گھٹائیں اٹھ رہی ہیں جو ایک عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیں ۔جس کے پیرہن سرخ ہیں کبھی نہ بجھنے والی آگ کا جنگل بسا ہو اور جس کی پیشانی پر شکن در شکن جال سا بچھا ہو۔تو پھر آپ کا کیا عالم ہوگا۔''

(۲۳ گھنٹے کا شہر/ احمد یوسف، افسانہ ''صورت ایک بے کیفی کی''ص،۴۶)

اصل افسانہ کی دید کو یقینی بنانے کے خیال سے اس کی شمولیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

*

صورت ایک بے کیفی کی

(افسانوی مجموعہ ۲۳ گھنٹے کا سفر سے ایک منتخب افسانہ)

آپ ہی سوچئے کہ صبح سے شام تک اگر آپ ایک ایسی تصویر دیکھتے رہیں کہ جس کی آنکھوں میں سیکڑوں من لکڑیوں کا جہنّم روشن ہو۔ایک قدم آگے بڑھے اور اس کے لپکتے شعلوں نے آلیا۔جس کے چہرے پر ایسی مہیب گھٹائیں اُٹھ رہی ہیں جو ایک عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔جس کے پیرہن سرخ میں کبھی نہ بجھنے والی آگ کا جنگل بسا ہو اور جس کی پیشانی پر شکن در شکن جال سا بچھا ہو۔تو پھر آپ کا کیا عالم ہوگا۔

ایسی صورت دیکھ کر آپ خوفزدہ ہوتے ہیں، جلتے ہیں کڑھتے ہیں ---کب یہ نیست و نابود ہو جائے، کب یہ فنا کی گھاٹ اُتر جائے۔آپ نہ ان احساسات کا کوئی صحیح نام دے سکتے ہیں اور نہ اس کی بربادیوں کے سلسلے میں کسی خاص فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔-بس یہ کہ کسی طرح وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب صبح تا شام ایک ہی کمرے میں رہنا ہو، اس عالم میں کہ ایک اہم گوشہ اس تصویر کے لئے مخصوص ہو تو آپ اس سے نظریں بھی نہیں چرا سکتے۔آنکھیں بند کر کے تو آپ کمرے میں چل پھر نہیں سکتے۔یہاں تو یہ صورت تھی کہ ----

اِک ذرا گردن اٹھائی دیکھ لی ----

میں نے اس مسئلے پر ایک آرٹسٹ دوست سے گفتگو کی، اور کئی ایک قسطوں میں اسے ساری بات بتا سکا کہ وہ غریب بھی بڑا بھاگتا دوڑتا سا آدمی تھا۔

میں نے آرٹسٹ سے کہا ---'' تم نے اس کی آنکھیں دیکھیں؟--اس کا چہرہ دیکھا؟ ---اس کا پیرہن سرخ ---اور اس کی پیشانی ---اُف میرے خدا کتنی ہی متوازی لکیریں اس پر کھنچی ہیں ---

آرٹسٹ نے کہا ---''ہر ایک لکیر دس سال کی نشانی ہے ---''

میں نے کہا ---''ہوش میں ہو، ارے وہ ہزار ہزار سال کی نشانیاں ہیں---خدا کی پناہ۔''

---اُس نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا ---''تم ضرورت سے زیادہ خائف ہو۔''

نہایت ردوقدح کے بعد بالآخر یہ طئے پایا کہ آرٹسٹ کئی نشستوں میں اس کام کو پورا کر دے گا، اوراس مہیب تصویر سے ایک قابل قبول صورت نکل آئے گی۔

آرٹسٹ اکثر وقت نکال کرآ جاتا، اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس تصویر کی طرف متوجہ ہو جاتا---

تصویر---رنگ،قلم اور برش۔

اس درمیان میں اپنی دنیا میں گُم رہتا۔ آرٹسٹ تصویر کی گرم آندھیوں کو برآمد کر کے، اس کے اندر صبا کی مست خرامی آباد کرنا چاہتا تھا۔

دیر تک وہ تصویر میں ڈوبا رہتا اور تب وہ ٹھنڈی سانس لیتا، جو ایسے وقتوں میں لی جاتی ہے، جب آدمی تھک کر کام دوسرے دن کے لئے اٹھا دیتا ہے۔

آرٹسٹ میرے قریب تپائی پرآ کر بیٹھ جاتا۔ وہ پیکٹ سے سگریٹ نکال کر منھ میں دباتا، اور اسے ایک خاص انداز سے جلا کر، میری طرف دھواں پھینکتے ہوئے کہتا۔

''اب کسی اور دن آؤں گا۔''

اُس دن میں نے تصویر کو دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ موسم کچھ بدل رہا ہے، لیکن میرے دل نے مجھے جھٹلاتے ہوئے کہا۔

''دراصل تم اب ان تپتے موسموں کے عادی ہو گئے ہو۔''

آرٹسٹ کو جب کبھی موقع ملتا وہ آ جاتا اور اِدھر اُدھر کی رسمی بات چیت کے بعد تصویر کو درست کرنے میں لگ جاتا۔

تب ایسا ہوا کہ اگر میرا دل کہتا کہ یہ محض تمہارا خیال ہے کہ تصویر سرد طبع ہو گئی ہے، تو میں سختی سے اس بات کو غلط ثابت کر دیتا، کیونکہ مجھے یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بلا خیز موسم تیزی سے گزر رہا ہے اور اب کوئی دم میں ٹھنڈی ہواؤں کے قافلے بس آیا ہی چاہتے ہیں۔

پھر ایک دن آرٹسٹ نے اعلان کیا کہ آج اس کا کام ختم ہو گیا۔ اس کے چہرے پر فتح مندی کا احساس جھلک رہا تھا۔

اُس نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔''اب ذرا اس تصویر کی طرف دیکھو۔''

میں نے تصویر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوش وخرم آبادیوں کا گیت لہک رہا تھا۔ ماتھے پر سنہری کرنیں چمک رہی تھیں، چہرے پر ایک روشن شہر جگمگا رہا تھا اور اس کے پیرہن میں سیکڑوں ستارے جھلملا رہے تھے۔

میں خوشی سے جھوم اُٹھا۔''آرٹسٹ تم واقعی گریٹ ہو۔ تم نے بالآخر اس کے اندر کے شیطان کو نکال پھینکا۔''

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ میں آسمانوں میں اڑا جا رہا ہوں۔ کبھی یہ کہ میں ایک تنہا کشتی پر کھڑا سرکش موجوں کے سینے پر تیزی سے بہتا جا رہا ہوں ----ننگے پاؤں برفیلی سطح پر دوڑتا جا رہا ہوں۔

میری خوشی نے دراصل میرے اندر کبھی نہ ہونے والی باتوں کی سرمستی بھر دی تھی۔

کئی دنوں تک مجھے اس کیفیت نے سرشار رکھا۔

لیکن جب یہ خوشی کی لہر گزر گئی اور میں نے اردگرد کا جائزہ لیا تو میں نے سوچا---- میں بھی کتنا دیوانہ ہوں ----نہ میں ہوا پر اُڑ سکتا ہوں، نہ اکیلے کشتی پر کھڑا سمندر کی بدمست لہروں پر بہہ سکتا ہوں اور نہ ہی ننگے پاؤں برف کی سطح پر دوڑ سکتا ہوں ----

خوشی کیا کسی معصوم خواہشیں رکھنے والے بچے کا نام ہے؟

یوں بھی انتہا درجے کی خوشی روح کو مردہ بنا دیتی ہے۔

مجھے یوں لگا کہ پھر وہی بےکیفی مجھ پر غالب آتی جا رہی ہے۔

تب ایک دن عجیب ایک سانحہ سا پیش آیا۔ میری بیوی ایک پلیٹ میں کچھ سیب اور ایک چُھری لے کرآئی اور اسے میز پر رکھ کر کچن میں چلی گئی۔

میں اپنے بستر پر لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک باب ختم کر کے میں نے کتاب نشان لگا کر رکھ دی اور میز پر رکھے سیب کی طرف متوجہ ہوا۔ اچانک میری نظر اس تصویر پر پڑی تو میرے منھ سے چیخ نکل گئی۔

اس کی آنکھوں میں پھر وہی چنگاریاں عود کر آئی تھیں، اس کے ماتھے پر پھر وہی صف درصف

شکلیں کھڑی تھیں، اس کا پیرہن پھر اسی طرح سُرخ سُرخ ہو گیا تھا ـــــ اور اس کی آنکھیں اس چُھری پر جمی تھیں جو سیبوں کے درمیان رکھی تھی۔

میری چیخ سن کر میری بیوی دوڑتی ہوئی آئی تو میں نے اس سے کہا۔

'' آرٹسٹ آئے تو اس سے کہنا کہ یہ تصویر پھاڑ کر پھینک دے، اور اس کی جگہ ایک نئی تصویر بنائے۔''

''یہ تصویر کبھی نہیں سُدھرے گی۔''

*

افسانوی مجموعہ 'رزم ہو یا بزم ہو' :

احمد یوسف کا افسانوی مجموعہ 'رزم ہو یا بزم ہو' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ کل بیس افسانوں پر مشتمل ہے۔ مشمولہ افسانوں کے عنوانات ہیں: 'گردن ناپنے والے'، 'قتل گاہ'، 'ملاقاتیں'، 'بجھی ہوئی روشنی'، 'دکھ ہماشا کے'، 'کچھ اس کی زبانی'، 'ایک ایک دن کا حساب'، 'گھر چلانے والی'، 'کچھ عجیب سے روز و شب'، 'ہوا یہ کہ ایک دن'، 'موت'، 'عروجی لمحے'، 'عینک ساز کلا رینٹ ماسٹر'، 'بازار'، 'بڑے گپتا، چھوٹے گپتا'، 'حسن پور سے'، 'خواب گر خواب شکن'، 'خاموشی کے حصار'، 'نقشوں اور ہندسوں کا زوال' اور 'رزم ہو یا بزم ہو'۔

مجموعہ کے متذکرہ افسانوں میں افسانہ ''ہوا یہ کہ ایک دن'' کا قصہ یہ ہے کہ یہ ایک Fantasy ہے۔ اس میں دو مرکزی کردار ہیں۔ ایک رکشے والا اور دوسرا ایک آفس کا بابو۔ رکشے والے نے جب منزل پر بابو کو پہنچا دیا تو بابو نے اسے جیب سے دو روپئے نکال کر دیئے کہ یہی اجرت طئے پائی تھی۔

اتفاق سے وہ دو روپے رکشے والے کے ہاتھ سے زمین پر گر گئے اور دو کا نوٹ بیس کا نوٹ بن گیا۔ بابو نے اس بیس کے نوٹ کو جھٹ اٹھا لیا اور رکشے والے کو دو روپئے دینے لگا۔ رکشے والا کہتا تھا کہ یہ دو روپئے کا نوٹ میرے ہاتھ سے زمین پر گر کر بیس کا نوٹ ہو گیا تو یہ میرا ہے اور بابو کہتے تھے کہ تم سے دو روپیہ مزدوری طئے پائی تھی، تم بیس کیوں لو گے؟ دو لو۔

اس کے بعد ایک مستقل تنازعہ کی صورت پیدا ہو گئی۔ کچھ لوگ بابو کے طرفدار ہو گئے اور انھوں نے یہ بات دل میں ٹھان لی کہ رکشہ والا ہی دھاندلی کر رہا ہوگا اور یہی سماج میں سب سے بڑا ظالم ہے:

> ''جب عام لوگوں کے لئے رکشے سے دفتر جانا ہی قیامت ٹھہرا تو پھر بابوؤں کی دھاندلی ان کی نظر میں کس طرح آسکتی ہے۔ اب ایسا بلند پایہ ظالم ان کے سامنے ہو تو فیصلہ یقینی اس کے خلاف ہی دیا جائے گا۔''

(رزم ہو یا بزم ہو/ احمد یوسف، افسانہ ''ہوا یہ کہ ایک دن''، ص ۶۱)

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو رکشہ والے کی حمایت کر رہے تھے اور ایسے لوگوں میں بیشتر وہ تھے جن کے جلوس کی زینت یہ رکشے والے ہوا کرتے تھے۔

اب دو قسم کی رائے آ رہی تھی۔ ایک رائے تو یہ تھی کہ رکشے والے سے دو روپے مزدوری طئے پائی ہے جس کا اقرار خود رکشے والا بھی کرتا ہے، تو پھر اسے دو روپے ہی دیئے جائیں، وہ بیس روپے کا حقدار کیسے ہو جائے گا۔ دوسری رائے یہ تھی کہ جب رکشے والے کے ہاتھ سے دو روپے کا نوٹ گر کر بیس کا نوٹ بن گیا تو وہ بیس کا نوٹ رکشے والے کا ہی ہے۔

بھیڑ کے درمیان کچھ لوگ رکشے والے کو کہہ رہے تھے کہ تم دو کا نوٹ لے لو اور کچھ بابو سے کہہ رہے تھے کہ وہ بیس کا نوٹ رکشے والے کے حوالے کر دے۔

آخر میں ایک رائے یہ آئی کہ یہ معاملہ دفترِ شہر یار تک پہنچایا جائے۔ تبھی ایک شخص کہتا ہے کہ:

''لوگوں کے حافظے کمزور ہو چکے ہیں۔ آخر وہ پنیر والا واقعہ کیوں بھول گئے کہ کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ترازو والے نے پوری پنیر چٹ کر ڈالی تھی۔''

(رزم ہو یا بزم ہو/ احمد یوسف، افسانہ ''ہوا یہ کہ ایک دن''، ص ۶۳)

آخر میں یہ بات طئے پائی کہ اس معاملے کو شہر کے ایک صاحبِ انصاف بزرگ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

بزرگ نے تین تین دفعہ تینوں سے پورا ماجرا سنا اور یہ کہا کہ آپ دونوں حضرات ایک ہی بیان دیتے ہیں اور دونوں نے تینوں بار اپنے بیان میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا اور 'دونوں یہ کہتے ہیں کہ دو کا نوٹ بیس کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا ہے'۔

لہٰذا بزرگ نے منطق یہ پیش کی کہ جب دو کا نوٹ رکشے والے کے ہاتھ سے گر کر بیس کا نوٹ ہو گیا تو وہ ہر حال میں اسی کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مگر پریشانی یہ ہے کہ بابو نے خود اپنی آنکھ سے نوٹ کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ گرتے ہی وہ بیس روپے کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا۔

اب قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ جو دو کا نوٹ زمین پر گر کر بیس کا نوٹ بن گیا ہے اگر رکشے والے کی جیب میں پہنچ کر بیس کے نوٹ میں تبدیل ہو جاتا تو بابو کو تو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

اس پر بابو نے بیس کا نوٹ رکشے والے کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد جب بزرگ نے عوام سے پوچھا کہ وہ اس فیصلے سے مطمئن ہیں کہ نہیں تو انھوں نے اس پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا اور سر جھکا کر دھیرے دھیرے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

اس افسانہ میں اہم یہ ہے کہ اصل مسئلہ یہاں روپئے اور اس کے سرکولیشن کا ہے کہ روپیہ جب سرکولیشن میں ہوتا ہے تو مزدور کی محنت سے ایک کا دو، دو کا چار اور چار کا آٹھ بنتا ہے۔ محنت یہاں قدرِ اضافی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی یہ کہ محنت خود سرمایہ ہے اور سرمائے کو بڑھاتی ہے۔ چنانچہ اس سرمائے سے جو اضافے کی صورت پیدا ہوتی ہے اس کا حقدار دراصل وہی ہے جو محنت کر کے اس میں اضافہ کرتا ہے۔

یہاں افسانہ نگار نے کچھ طبقاتی مفاد کی بات بھی کی ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ محنت کو قدرِ اضافی نہیں مانتے ہیں اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ محنت سرمائے میں اضافہ کرتی ہے۔ اس معاملے میں وہ صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے حلقے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

وہ سارے لوگ جو بابو کا ساتھ دے رہے تھے، اسی خیال کے حامی تھے کہ صرف سرمایہ ہی سرمائے کو آگے بڑھاتا ہے اور محنت کوئی بڑا رول ادا نہیں کرتی۔ پنیر والا قصہ دراصل ہماری نوکر شاہی کی دھاندلیوں کی داستان سناتا ہے جو خود کرپٹ ہے اور کبھی بھی مزدور طبقے کے حق میں بات نہیں کر سکتی۔ محلے کے بزرگ دراصل ایک انصاف پسند، ایماندار اور حق گو آدمی ہیں اور وہ رکشے والے کو یعنی مزدور کو اس قدرِ اضافی کا جائز حقدار سمجھتے ہیں اور سچ پوچھئے تو لوگوں کو ان کی جانب سے یہ یقین کامل تھا کہ اس راہ میں ان کا فیصلہ بہر حال قابلِ قبول اور منصفانہ ہوگا۔ چنانچہ مسئلہ کے تدارک کے لئے ان کی شرکت ضروری خیال کی گئی۔ یہاں کچھ اخلاقیات کی بات بھی کی گئی ہے کہ اب سچائی اور انصاف کے حق میں وہی لوگ فیصلہ سنا سکتے ہیں جو ایک اعلیٰ اخلاقی تصور رکھتے ہیں اور ایک بڑی طاقت کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں۔

یہاں متذکرہ افسانہ کو اس اعتبار سے شمولیت دی جا رہی ہے کہ اس سے براہ راست متعارف ہوا جا سکے۔

ہوا یہ کہ ایک دن

(افسانوی مجموعہ رزم ہو یا بزم سے ایک منتخب افسانہ)

وہ رکشے سے اُترا تو اس کی جیب خاصی گرم تھی، یوں کہ یہ مہینے کی دوسری تیسری تاریخ تھی۔ جب کبھی دفتر کے بابو رکشے سے گھر لوٹتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابھی مہینے کا پہلا ہفتہ ختم نہیں ہوا ہے کیوں کہ اس کے بعد تو سرکاری بسیں اور ان کا انتظار ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

رکشے والے سے دو روپے طئے ہوئے تھے۔ اپنی گلی کے موڑ پر پہنچ کر اس نے رکشہ رکوایا اور اوپر کی جیب سے دو روپے نکال کر رکشے والے کی طرف بڑھائے۔ رکشے والے نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لیا لیکن جانے کس طرح وہ اس کے ہاتھ سے گر کر زمین پر آ رہا۔ تب ہی ان دونوں نے دیکھا کہ وہ دو ۲ کا چھوٹا نوٹ بیس ۲۰ کا ایک بڑا نوٹ بن چکا تھا۔ دفتر کے بابو نے جھٹ بڑھ کر وہ بیس ۲۰ کا نوٹ اٹھا لیا اور بڑی پھرتی سے اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور پھر ایک دوسرا دو کا نوٹ جیب سے نکال کر رکشے والے کو دینے لگا۔

اس پر رکشے والے سے اس کا تنازعہ شروع ہو گیا۔ رکشے والا کہتا تھا کہ وہ بیس ۲۰ کا نوٹ اس کا ہے کیوں کہ وہ اس کے ہاتھ سے گرا تھا۔ لیکن بابو کہتا تھا کہ چونکہ مزدوری دو ۲ روپے طئے پائی تھی اس لئے رکشے والا صرف دو ۲ روپے کا حق دار ہے، جو وہ اسے دے رہا ہے۔

آہستہ آہستہ لہجہ تیز ہو گیا۔ پھر نوبت تُو تُو میں میں کی آ گئی۔ رکشے والا بولا۔

''بابو جی بیس ۲۰ کا نوٹ میرا ہے۔ آپ کی نیت خراب ہو گئی ہے۔''

دفتر کا بابو کہہ رہا تھا۔ ''بے ایمان تم ـــــ تم سے دو ۲ روپے طئے ہوئے تھے وہ میں دے رہا ہوں۔ دو ۲ طئے کر کے بیس ۲۰ لینا چاہتے ہو۔''

تب ہی وہاں کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اور بھیڑ سی لگ گئی۔

چند صائب الرّائے لوگوں نے دونوں فریق کے بیان سننے کے بعد اپنے طور پر کچھ فیصلہ بھی دینا چاہا۔ بھیڑ میں بیشتر لوگ ایسے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ دھاندلیوں کے اس جہان میں وہ گھر سے نکل کر سب سے پہلے جس دھاندلی باز سے متعارف ہوتے ہیں وہ رکشے والا ہوتا ہے۔ یوں کہ اگر اس کا رُخ پچھّم کی طرف ہے تو وہ کسی بھی قیمت پر پورب، اُتّر اور دکھّن کی جانب جانے کا روادار نہ ہوگا۔ اور اگر پُورب کی سمت کھڑا ہے تو پھر پچھّم، اتّر اور دکھّن کی سواریاں لینا اس کے لئے حرام قرار پائے گا۔

پھر چلچلاتی دھوپ، تیز بارش اور سرد راتوں میں روپے کی جگہ دو ۲ روپے اور دو ۲ روپے کی جگہ چار روپے مانگے گا۔ اس کے علاوہ میلوں ٹھیلوں اور تہوار کے موقع پر مزدوری دوگنی اور تگنی کر دے گا۔

جب عام لوگوں کے لئے رکشے سے دفتر جانا ہی قیامت ٹھہرا تو پھر بابوؤں کی دھاندلی ان کی نظر میں کس طرح آ سکتی ہے۔

اب ایسا بلند پایہ ظالم ان کے سامنے ہو تو فیصلہ یقینی اس کے خلاف ہی دیا جائے گا۔

''بڑے چور ہوتے ہیں یہ لوگ۔''

''خود ہی کہہ رہا ہے کہ دو ۲ روپے طئے ہوئے تھے۔ تو پھر دو ۲ روپے لینے سے انکار کیوں کر رہا ہے؟''

''ارے ان لوگوں کی بدنیتی کا حال کچھ نہ پوچھو''

''اوسط درجے کے لوگوں کا تو انھوں نے خانہ خراب کر دیا ہے۔''

رکشے والے کی آواز اتنی ساری آوازوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی۔ تب ہی وہاں کچھ ایسے لوگ آ گئے جن کے جلوس کی شان رکشے والے بنا کرتے تھے۔

''نوٹ آپ کا نہیں، رکشے والے کا تھا جو اس کے ہاتھ سے گر کر دو ۲ سے بیس ۲۰ ہو گیا۔ وہ نوٹ اسے دے دیں۔''

ایک گروہ ان لوگوں کا بھی آ گیا جو یہ کہتے تھے کہ مزدور کا پسینہ سوکھنے سے پہلے اُسے اس کی مزدوری دے دو۔

''یہ شور شرابہ کیوں؟''

ان تازہ وارد ہمدردوں کے سبب رکشے والے کی ڈوبتی آواز کو سہارا ملا۔

’’بابو جی وہ دو کا نوٹ میرا تھا جو زمین پر گر کر بیس [۲۰] بن گیا۔‘‘

لیکن بابو کہہ رہا تھا۔’’اگر تمہیں دینے کے عمل میں دو [۲] کا نوٹ زمین پر گر کر بیس [۲۰] کا نوٹ بن گیا تو یہ میری قسمت کا ہے۔یوں بھی تم صرف دو کے حق دار ہو۔‘‘

اب سبھی مکتبۂ فکر کے لوگ جو وہاں یک جا تھے معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔

’’مزدوری دو [۲] روپے طئے ہوئی تھی۔اس سے نہ رکشے والا انکار کرتا ہے اور نہ بابو انکار کرتا ہے۔‘‘

’’بابو نے دو [۲] روپے دیئے تھے۔اس سے بھی کسی فریق کو انکار نہیں ہے۔‘‘

’’اور اب بھی سبھوں کے سامنے بابو رکشے والے کو دو [۲] روپے دے رہا ہے۔‘‘

’’لیکن وہ بیس [۲۰] کا نوٹ جو دو سے بیس بن گیا؟ ـــــ وہ بابو کی جیب میں سے ـــــ‘‘

بس یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر ان کی عقل سپر ڈال دیتی تھی۔

’’کس کے حق میں فیصلہ کیا جائے؟‘‘

’’مزدوروں کے حقوق کی نگہبانی کرنے والوں کی عقل بھی گُم تھی کیونکہ ان کے سامنے بابو دو [۲] روپے کا نوٹ لئے کھڑا تھا۔

لیکن رکشے والا اس بیس [۲۰] کے نوٹ کی بات کر رہا تھا جو لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔

اب بھیڑ واضح طور پر کئی حصوں میں بٹ گئی تھی۔

’’تم دو [۲] روپے لے لو۔‘‘

’’آپ اسے بیس [۲۰] روپے دے دیں۔‘‘

’’نہیں، اتنی جلدی کسی فیصلے پر نہ پہنچئے۔‘‘

تب ہی بھیڑ میں سے کسی نے کہا کہ معاملہ دفتر شہر یار کے سپرد کر دینا چاہئے کہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ہما شما کی فہم سے بالاتر ہے۔

پھر کتنی ہی آوازیں اس ایک آواز کی ہم نوا بن گئیں۔

لیکن اسی گھڑی ایک اور طرف سے کسی نے کہا۔

’’لوگوں کے حافظے کمزور ہو چکے ہیں۔آخر وہ پنیر والا واقعہ کیوں بھول گئے کہ کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ترازو والے نے پوری پنیر چٹ کر ڈالی تھی۔‘‘

بتانے والے پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسنے لگے۔

’’کیا واقعہ یاد دلایا ہے ـــــ واہ ـــــ واہ ـــــ واہ ـــــ‘‘

’’وہاں پہنچ کر نہ تو دو [۲] رہے گا نہ بیس‘‘

’’پھر کیا کیا جائے؟‘‘ یہ سوالیہ نشان سبھوں کے آگے تھا۔

رکشے والا اور بابو بھی اب بحث کرتے کرتے تھک چکے تھے۔اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ انہیں یک گونہ اطمینان سا ہو گیا ہے کہ انھوں نے معاملہ عوامی عدالت کو سونپ دیا ہے۔

کچھ دیر بھیڑ کے درمیان مکھّیاں سی بھنکتی رہیں، جیسے کھیل کا درمیانی وقفہ ہوا ہو اور لوگ یا تو اطمینان کی سانس لے رہے ہوں یا غور و فکر میں ڈوبے ہوں۔کہیں ایک کونے میں دو [۲] افراد آپس میں چُپکے چُپکے باتیں کر رہے تھے۔ان میں سے ایک نے قدرے زور سے کہا۔

’’بالکل ٹھیک خیال ہے تمہارا۔‘‘

ایک ساتھ کئی آوازیں اُبھریں۔’’کون سا خیال بھائی؟‘‘

’’جناب، میں کہہ رہا ہوں کہ وہ جو ویران کُوچے میں ایک بزرگ رہتے ہیں، ہم کیوں نہ ان سے رجوع کریں۔‘‘

سبھوں نے بیک آواز کہا۔’’کیا ترکیب سوجھی ہے میاں، جیتے رہو۔‘‘

تب سبھی لوگ کشاں کشاں اس ویران کوچے کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

نحیف و زار سے ایک بزرگ تخت پر بیٹھے مطالعے میں منہمک تھے۔ننگے سر افراد کی بھیڑ میں تنہا ان کے سر پر ٹوپی تھی اور پاس ہی جائے نماز بچھی تھی۔

تسلیم و بندگی کے بعد بھیڑ نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

بزرگ نے پوچھا۔میرا فیصلہ آپ لوگ مانیں گے؟‘‘

سبھوں نے ایک ساتھ کہا۔’’ہمیں آپ پر کامل اعتماد ہے۔آپ کا ہر فیصلہ ہمیں قبول ہوگا۔‘‘

بیشتر لوگوں کو اس بات کا تجسُّس تھا کہ آخر وہ اس عجیب و غریب معاملے کو کس طرح سلجھاتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ سب کے سب وہاں سے چلے آئے تھے حالاں کہ شام ڈھل چکی تھی اور گھروں کے چراغ کب کے جل چکے تھے۔

تب بزرگ نے رکشے والے اور بابو سے دریافت کیا۔

''آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟''

ان لوگوں نے بھی وہی کہا جو سب کہہ رہے تھے۔ ''بالکل مانیں گے جناب۔''

''تو اب مقدمہ پیش کیجیے۔'' پہلے انھوں نے رکشے والے سے فرمائش کی۔

وہ بولا۔ ''میری مزدوری دو ۲ روپے طئے ہوئی تھی۔ بابو نے مجھے دو ۲ روپے کا نوٹ دیا جو میرے ہاتھ میں آکر زمین پر گرا اور دو ۲ کے بیس ۲۰ ہو گئے۔ اس پر بابو نے اُسے جھٹ اُٹھالیا۔ اور اسے جیب میں رکھ کر انھوں نے مجھے دوسرا دو ۲ کا نوٹ دیا۔ اس پر میں نے کہا کہ وہ نوٹ میرے ہاتھ میں آکر زمین پر گرا ہے اور بیس ۲۰ کے نوٹ میں بدل گیا ہے۔ اس طرح وہ بیس کا نوٹ.....''

پھر انھوں نے بابو سے دریافت کیا۔

بابو نے کہا۔ ''میں نے اس کی طئے شدہ مزدوری جو دو ۲ روپے طئے ہوئی تھی اسے دیا تو وہ نوٹ اس کے ہاتھ سے گر کر زمین پر آرہا اور بیس ۲۰ کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا یوں کہ اس کی مزدوری صرف دو روپے طئے ہوئی تھی، اب میں اسے دو ۲ کا دوسرا نوٹ دے رہا ہوں، لیکن اس کی نیت بدل گئی اور یہ مجھ سے بیس ۲۰ والا نوٹ مانگتا ہے۔ درآں حالیکہ اس کی مزدوری صرف دو روپے تھی، جس کا یہ بھی اقرار کرتا ہے۔''

بزرگ نے باری باری دونوں سے تین تین بار ان کے بیانات سنے۔ پھر وہاں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ کیوں کہ بزرگ مراقبے میں چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے سر اُٹھایا اور ان سے یوں مخاطب ہوئے۔

''بھئی میں نے آپ دونوں کے بیانات تین تین بار سنے محض اس لئے کہ شاید پہلے بیان سے دوسرے میں کوئی فرق آجائے اور دوسرے سے تیسرا کسی قدر مختلف ہو لیکن بحمد اللہ کہ ہر بار آپ لوگوں نے ایک ہی بیان دیا۔

- رکشے والے کی مزدوری کے دو ۲ روپے ہوئے تھے، یہ آپ دونوں مانتے ہیں۔
- بابو نے رکشے والے کو دو ۲ روپے دیئے تھے، یہ آپ دونوں کہتے ہیں۔
- دو کا نوٹ رکشے والے کے ہاتھ میں آکر زمین پر گر گیا اور بیس ۲۰ کے نوٹ میں تبدیل

ہو گیا۔ اسے آپ دونوں تسلیم کرتے ہیں۔

''اب یہیں سے جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ بابو کا یہ کہنا ہے کہ چوں کہ مزدوری دو ۲ روپے طئے ہوئی تھی اس لئے رکشے والا بیس روپے کا حقدار نہیں ہوسکتا۔''

''رکشے والا کہتا ہے کہ چوں کہ وہ دو ۲ روپے کا نوٹ جو اسے مزدوری میں دیا گیا تھا اس کے ہاتھ میں آکر زمین پر گرا اور بیس ۲۰ کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا، اس لئے وہ اس کا ہے۔''

''بابو کی نیت میں اگر کھوٹ ہوتا تو وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ انھوں نے غلطی سے بیس ۲۰ کا نوٹ دے دیا تھا اور جب وہ زمین پر گر پڑا تو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اور انھوں نے وہ نوٹ جیب میں رکھ کر رکشے والے کو دو ۲ کا نوٹ دینا چاہا لیکن اب وہ بیس ۲۰ کے نوٹ پر اپنا دعویٰ کرتا ہے۔''

''لیکن ایسی بات نہیں ہوئی۔ دونوں یہ کہتے ہیں کہ دو ۲ کا نوٹ بیس ۲۰ کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا ہے۔''

''یہاں دیکھنا یہ ہے کہ.....'' انھوں نے بابو کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مزدوری کے دو ۲ روپے دیئے۔ رکشے والے سے آپ کا معاملہ ختم ہوا۔''

''اب اگر وہ نوٹ اس کے ہاتھ میں آکر زمین پر گر گیا اور بیس ۲۰ کے نوٹ میں تبدیل ہو گیا تو وہ ہر حال میں اس کا ہے۔''

''بالفرض محال وہ دو ۲ کا نوٹ رکشے والے کی جیب میں پہنچ کر بیس ۲۰ کے نوٹ میں تبدیل ہو جاتا تو آپ کیا کر لیتے؟''

''اس عالم میں تو آپ کو اس تبدیلی کی خبر بھی نہیں ہوتی۔''

''پریشانی یوں ہوئی کہ آپ نوٹ کی تبدیلی سے واقف ہو گئے۔''

اس پر بابو نے بیس کا نوٹ جیب سے نکال کر رکشے والے کے حوالے کر دیا۔

بزرگ نے خلقت سے دریافت کیا۔۔۔ ''غالباً آپ لوگ اس فیصلے سے مطمئن ہوں گے۔''

لیکن کسی نے اس فیصلہ پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ سب سر جھکائے دھیرے دھیرے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

❋

احمد یوسف کی رپورتاژ نگاری

تعارف ۔ محفل محفل :

احمد یوسف کی ۹؍رپورتاژ پر مشتمل کتاب 'محفل محفل' ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ مذکورہ کتاب ۱۸۴صفحات پر مبنی ہے۔

ان کی رپورتاژ کے عنوانات ہیں • ابھی تو ہیں دلِ شاعر میں سیکڑوں ناسور • فکر وفن کی ایک شام • غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں • نئے پرانے رشتے • عارفِ نبضِ سخن، مالک فن، سالک فن • اک نئی کتاب آئی • فسانہ بنے گا کل • آؤ تمہاری یاد میں کچھ شعر ہی کہیں • اور افسانہ کل اور آج۔

کتاب کے اوّل وآخر کے داخلی فلیپ پر رپورتاژ کے مزاج واطوار کی مناسبت سے آبِ حیات سے محمد حسین آزاد، دلی کی آخری شمع سے مرزا فرحت اللہ بیگ، عظیم آباد کا ایک یادگار مشاعرہ سے ڈاکٹر محمد یوسف خورشیدی اور پودے سے کرشن چندر وغیرہ کے اہم فرمودات پر مبنی مختصر اقتباسات لئے گئے ہیں جو مشمولہ مضامین سے گہری نسبت کے ساتھ وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔

'محفل محفل' میں 'ابھی تو ہیں دلِ شاعر میں سیکڑوں ناسور' نمبر شمار کے اعتبار سے پہلی رپورتاژ ہے جس میں آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کے زیر اہتمام اسٹوڈیو میں منعقد ایک مشاعرے کا قصہ رقم کیا گیا ہے۔ غیر منقسم بہار یعنی فی الوقت کی ریاست بہار وجھارکھنڈ سے کئی اہم شاعروں نے اس بزم میں شرکت کی تھی۔ چونکہ بزم کے شرکاء میں سبھی جدید شعراء تھے لہٰذا اس کے پیش نظر جدیدیت سے موسوم اس نئے رجحان پر سہیل عظیم آبادی کی مختصر سی مگر انتہائی بصیرت افروز تقریر کا بھی یہاں بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ اس رپورتاژ کی اشاعت رسالہ 'شاعر' میں

۱۹۶۸ء میں ہوئی تھی مگر یہ پروگرام کب ہوا تھا اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

'فکر وفن کی ایک شام' کے عنوان سے تحریر کی گئی رپورتاژ مورخہ ۹؍نومبر بروز اتوار جناب مظہر امام کی نشست گاہ میں منعقد ایک ادبی نشست کے احوال پر مبنی ہے۔ یہاں پروگرام کی تاریخ تو رقم کی گئی ہے مگر سن عیسوی ندارد ہے۔ 'مورچہ' گیا میں اس کی شاعت ۱۹۶۹ء میں ہوئی تھی۔

'غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں' کے عنوان سے تحریر کی گئی رپورتاژ جناب شکیب ایاز کی قیام گاہ پر مورخہ ۲۹؍نومبر ۱۹۶۹ء کو بے صدر مع افطار وطعام کے آراستہ ایک ادبی نشست کے احوال سے ہمیں روشناس کراتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رپورتاژ شائع نہیں ہوئی ہے کیونکہ دیگر رپورتاژ کی روش کے اعتبار سے اس کے اختتام پر اس نوع کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔

بعنوان 'نئے پرانے رشتے' تحریر کردہ رپورتاژ میں شفیع مشہدی کے فلیٹ پر آراستہ کی گئی ایک نشست کے احوال پیش کئے گئے ہیں جہاں اردو اور ہندی کے اہلِ قلم نے شرکت کی تھی۔ شعراء کے کلام سنانے کے ساتھ ہی اس نشست میں ہندی اور اردو ادب کے تعلق سے سیر حاصل بحث بھی کی گئی تھی۔ اس رپورتاژ کی اشاعت کے تعلق سے 'صبح نَو' ۱۹۷۱ء درج ہے۔

'عارفِ نبضِ سخن، مالکِ فن، سالکِ فن' کے زیر عنوان تحریر کی گئی رپورتاژ کا قصہ یہ ہے کہ یہ خدابخش لائبریری کے کرزن ریڈنگ روم میں حلقۂ ادب کی جانب سے منعقد کئے گئے ۲۱ اور ۲۲؍اپریل کے دوروزہ ادبی اجلاس سے متعلق ہے جو بہ یادگارِ اختشام حسین آراستہ کیا گیا تھا۔

پروگرام کے پہلے دن کی صدارت پروفیسر عطا الرحمٰن نے کی تھی جبکہ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت سید حسن سرمد اور تیسرے اجلاس کی صدارت سہیل عظیم آبادی نے کی تھی۔ پروگرام کی نسبت سے یہاں احمد یوسف کا ایک بڑا ہی معنی خیز اور توجہ طلب جملہ تحریر کیا گیا ہے۔ 'ہال سے نکلتے ہوئے ہم سوچ رہے ہیں وہ چراغ تھا جو بہت سے چراغوں کو روشن کر کے آگے کی طرف سفر کر گیا'۔ اس رپورتاژ کی رسالہ 'آہنگ' کے اختشام حسین نمبر میں ۱۹۷۳ء میں اشاعت ہوئی تھی۔

رپورتاژ 'اک نئی کتاب آئی' ڈاکٹر محمد محسن کی کتاب انوکھی مسکراہٹ کے اجراء کے سلسلے میں مورخہ ۶؍اکتوبر کی شام لطیف عالم منزل میں منعقد کی گئی ایک ادبی نشست سے متعلق ہے۔ اس نشست

میں اہل نظر نے جہاں محمد محسن کے فن کے تعلق سے بحث میں حصہ لیا وہیں کئی شعراء نے اپنے کلام بھی پیش کئے۔ اختر اور ینوی نے اس نشست کی صدارت کی تھی۔ رپورتاژ کے اختتام پر آہنگ۔ صبح نو ۱۹۷۳ء درج ہے۔

'فسانہ بنے گا کل' کے عنوان سے تحریر کی گئی خاصی طویل رپورتاژ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقد ایک سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کے تفصیلی بیان پر مبنی ہے۔ مذکورہ سمینار میں جہاں ہندوستان کی ہندی اور اردو کی بڑی شخصیتوں نے شرکت کی تھی وہیں برطانیہ سے ساقی فاروقی کی بھی تشریف آوری ہوئی تھی۔ قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، علی سردار جعفری اور گوپی چند نارنگ کے علاوہ تقریباً عالمی سطح کے مقبول ادیبوں کے وہاں جلوے ہی جلوے تھے۔ اس سمینار کا افتتاح قرۃ العین حیدر نے کیا تھا اور اس کے افتتاحیہ سیشن کی صدارت شیخ الجامعہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کی تھی۔ سمینار میں شاعری، افسانے اور ناول پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ مذکورہ رپورتاژ کی اشاعت کے سلسلے میں 'آہنگ'، ۱۹۷۶ء درج ہے۔

'آؤ تمہاری یاد میں کچھ شعر ہی کہیں'۔ مذکورہ رپورتاژ ۲۷/مارچ کو غالب اکیڈمی میں اظہار اثر کے پہلے مجموعہ کلام 'بشارت' کے اجراء کے سلسلے میں خلیق انجم، مخمور سعیدی، گوپال کرشن عابد، کمار پاشی، امیر آغا قزلباش، پریم گوپال متل، شمیم صدیقی، عتیق صدیقی اور شمیم حنفی کے ذریعہ آراستہ کی گئی مجلس کے احوال بیان کرتی ہے۔

اس مجلس کی نظامت مخمور سعیدی نے صدارت مسعود حسین نے اور افتتاحی تقریر قاضی سجاد حسین نے کی تھی۔ رپورتاژ کے اختتام پر صرف ۱۹۷۶ء درج ہے۔

افسانہ 'آج اور کل' کے عنوان سے تحریر کی گئی رپورتاژ ۲۰، ۲۱ اور ۲۲/جولائی ۱۹۸۵ء کو خدا بخش لائبریری میں منعقد ایک سہ روزہ افسانوی نشست سے متعلق ہے۔ اس افسانوی نشست کے تمام سیشن کی صدارت ڈاکٹر محمد محسن نے کی تھی اور افتتاحی و اختتامی تقریر مشہور افسانہ نگار کلام حیدری نے کی تھی۔

احمد یوسف کے اس مجموعۂ رپورتاژ میں شامل سبھی رپورتاژ کا میری نظر میں کمال یہ ہے کہ وہ تخلیقیت کے حسن سے مزین ہیں۔ احمد یوسف پائے کے افسانہ نگار ہیں اور اپنے مخصوص طرزِ تحریر کے لئے بطورِ خاص پہچانے جاتے ہیں۔ چنانچہ تراشے ہوئے مسجع جملے، نفیس و دلکش اندازِ بیان اور قصّے کی مناسبت

سے اشعار کی برمحل شمولیت نے ان کی رپورتاژ کو بشوق مطالعے کے قابل بنا دیا ہے۔ رپورتاژ دراصل رپورٹ ہی تو ہے جس میں محض قصے کو مرکزیت حاصل ہے مگر اندازِ پیشکش میں حسن بھی شامل ہو جائے اس کی گنجائش کی آرزو تو فضول ہے مگر احمد یوسف نے اپنی اعلیٰ وارفع تحریری صلاحیتوں کے بوتے اس مجموعہ کے ایک ایک قصے کو تخلیقی رنگ و آہنگ عطا کرنے میں کہیں سے کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ ان کی رپورتاژ سے گزرتے ہوئے جا بجا ان کے افسانوی اسلوب کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ اُردو میں رپورتاژ نگاری کے تعلق سے احمد یوسف کے مقام و مرتبہ کا جہاں تک سوال ہے تو نہایت ذمہ داری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں رپورتاژ نگاری کو باضابطہ ایک صنف کا درجہ دیئے جانے کا سہرا احمد یوسف کے سر جاتا ہے۔

احمد یوسف کی رپورتاژ 'محفل محفل' کے مختصر تعارف کے بعد ان کی ایک مکمل رپورتاژ بعنوان 'غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں' یہاں اس خیال کے پیشِ نظر پیش کی جا رہی ہے کہ براہِ راست ان کے طرزِ تحریر سے روبرو ہونے کا کچھ سامان ہو سکے۔

غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں : (رپورتاژ)

اوپر جاتے ہوئے وقت نے ہمیں ایک زینہ نیچے اُتار دیا ہے۔ بس دو گھڑی پہلے کی بات ہے کہ ہم اسی مقام پر ملے تھے، یہیں شکیب ایاز کے یہاں۔ ہاں اس وقت ہمارے درمیان ظفر اوگانوی، لطف الرحمٰن، قمر اعظم ہاشمی اور نوالہدیٰ بھی تھے۔ مشکل سے دو گھڑی گذری ہوگی اور تم کہتے ہو پورا ایک سال

"کوئی بڑھ کر اس کی باگ تھام لے"

۲۹ رنومبر ۱۹۶۹ء -----ایک سال بعد ----- پر سب کچھ تو وہی ہے۔ وہی لوگ، وہی مکان اور پھر دور سے آتی ہوئی آواز کہ تمہارے حصے میں ایک اور نیک دن کا اضافہ ہوگیا۔ گلاسوں کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ، وہی قیام، وہی رکوع و قیود، وہی سجدہ، وہی پھیلا ہوا دسترخوان کہ سوچنا پڑے کہ ہاتھ کدھر کو لے جائیں۔ وہی گرم گرم چائے۔

قصہ یہ ہے دوستو کہ -----

"بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء"

اس لئے ایسی صحبتوں کو ہم طوق و سلاسل دے کر یادوں کے شہر میں پہنچا دینا چاہتے ہیں۔

"تو ہم یوں کریں کہ اس نشست کی کارروائی کو کسی صدر کے بغیر ہی چلنے دیں۔"

ظہیر صدیقی کی یہ تجویز پسند کی گئی -----

یہ روایت شکنی ہے یا روایت گری ----- ؟

شکیب ایاز کی قیام گاہ -----

۲۹ رنومبر ۱۹۶۹ء

افسانے، غزلیں اور نظمیں (بے صدر) مع افطار و طعام۔

ظہیر صدیقی نے پورا خاکہ تیار کر دیا۔

شبیر احمد کو کہانی سنانے کی دعوت دی گئی ہے۔

کہانی کا عنوان ہے۔ **خَیْرٌ مِّنَ النّوم**

اس مختصر سی کہانی پر عبد المغنی کو اقبال کا ایک قطعہ یاد آ گیا۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

احسان نظر نے کہا یہ کہانی ختم ہوتے ہوتے عنوان سے الجھ کر رہ گئی ہے۔

یہ کہانی ایک ایسے شخص سے متعلق ہے جو خواب کے عالم میں خیر و شر کے تصادم سے دوچار ہے۔ حتیٰ کہ وہ خواب ہی میں بڑبڑانے لگتا ہے اور بیوی کے جگانے پر ٹوپی کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کے دل میں نماز کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے کہانی میں اذان کی صدا کا ذکر نہ کرتے ہوئے بھی ذکر کر دیا ہے۔ یہ اس کہانی کا بڑا حُسن ہے۔ گویا خیر کی فتح ہوتی ہے۔ یہ احمد یوسف کی رائے ہے۔

ظہیر صدیقی نے کہا۔ اختتام بہت ہی حسین ہے۔ خیر و شر کا تصادم غنودگی یا نیم غنودگی کے عالم سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں وہ ساری جزئیات آجاتی ہیں جو کہانی کی تعمیر میں حصہ لیتی ہیں۔ وہ ایماندار انسان جو کچھ اگاتا ہے اس کا بہت کم حصہ خود پاتا ہے۔ عنوان بے انتہا Suggestive ہے۔

آخر میں شبیر احمد نے بتایا کہ یہ کہانی ایک کسان کی زندگی سے متعلق ہے جس کے اندر دو طاقتوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے اور بالآخر وہ خیر کی طرف رجوع کرتا ہے۔

حضرات اب کچھ غزلیں سنی جائیں۔

متین الحق عمادی کی غزل خاصی کامیاب ہے کئی اشعار پر انہیں داد ملی ہے۔

تیری قربت سے مہکتے ہوئے لمحوں کی قسم
کب تیری یاد میں اس دل نے اجالا نہ کیا

اور یہ غزل شکیب ایاز کی ہے۔جس کے کچھ اشعار انگلیاں اٹھا اٹھا کر نقشے پر ایک شہر کو دکھا رہے ہیں۔ جہاں حالیہ دنوں میں قتل وغارت گری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

خط میں لکھا تھا کہ کل شام تک آجائیں گے
بیچ میں کیا ہوا پردیش سے آنے والے
آفتابوں کی کرن کام نہ کر پائے گی
رنگیں پوشاک کو دھوپوں میں سکھانے والے

تب احسان نظر نے دریافت کیا کہ آفتابوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟

شکیب نے صفائی میں کہا آخر پانیاں بھی تو استعمال کرتے ہیں۔

احمد یوسف نے کہا لیکن پانیوں تو Waters کا ترجمہ ہے -----آفتابوں کے ساتھ تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

اعجاز سوری نے نئے سائنسی انکشافات کے متعلق بولتے ہوئے کہا کہ اس نظام شمسی سے پرے کئی اور نظام ہائے شمسی ہیں، جہاں کئی کئی آفتاب ملتے ہیں۔

شکیب ایاز کہہ رہے ہیں۔ہم لوگ آفتاب کی علامت طاقت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

مظہر امام نے دریافت کیا کہ ہم لوگ سے ان کی کیا مراد ہے۔

یعنی ہم جدید شعراء -----

آپ کے علاوہ اور کن لوگوں نے آفتاب کو ان معنوں میں استعمال کیا ہے۔

مظہر امام نے سوال کیا۔

کم از کم میں نے تو انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔شکیب کا جواب تھا۔

اور پھر یہ دھوپوں کیوں؟ ایک نیا سوال اُٹھایا گیا ہے۔ احمد یوسف نے کہا۔ یہ آفتابوں کی رعایت سے استعمال کیا گیا ہے۔اس ایک شعر میں انھوں نے کئی ایک اجتہاد کئے ہیں۔

اس پر دوستوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

اور جب قہقہے تھمے تو احمد یوسف سے افسانہ سنانے کی فرمائش کی گئی۔

میرے پاس کوئی تازہ افسانہ نہیں ہے۔ اس لئے کچھ دنوں پہلے کا لکھا ہوا ایک افسانہ سناتا

ہوں۔عنوان ہے۔'غمزدوں کی برات۔'

جذبی کا شعر ہے۔

دلوں میں آگ، نگاہوں میں آگ، باتوں میں آگ
کبھی تو یوں بھی نکلتی ہے غمزدوں کی برات

افسانہ ختم ہوا تو اشاروں نے کئی ایک آنکھوں کا سفر کیا۔

احسان نظر نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ یہ کہانی میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ میں نے اس وقت بھی پسند کیا تھا۔آج بھی یہ تازہ ہے۔احمد یوسف کے یہاں یہ تاثر دیرپا ہوتا ہے۔

ظہیر صدیقی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ احمد یوسف اتنے اچھے جملے تراشتے ہیں کہ ہم ان کے حُسن میں کھو جاتے ہیں۔ یہ ان کا کامیاب افسانہ ہے۔

عبدالمغنی نے احمد یوسف کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ان کا فن اشاریت اور رمزیت کا فن ہے۔ اکثر کہانیوں میں رمزیت اور ایمائیت کی بنا پر چیزیں دھندلکوں میں کھو جاتی ہیں۔لیکن اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں رمزیت اور ایمائیت کے باوجود وہ کہر آلود فضا نہیں جو ان کے اکثر افسانوں میں ملتی ہے۔ اتنے نازک سے موضوع کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔مظہر امام نے ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔احمد یوسف کے یہاں واضح رمزیت پائی جاتی ہے۔

آخر میں آفتاب ندیم نے اپنی رائے کا اظہار اس طور پر کیا کہ جس کردار کو انھوں نے پیش کیا ہے،اس کی زبان اور اس کے لب ولہجہ کو بھی اپنایا ہے۔نفسیاتی اعتبار سے بھی یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔

شکیب نے پوچھا -----''نفسیات کہاں؟''

''نفسیات کہاں نہیں ہے'' -----یہ آفتاب کا جواب تھا۔

اختر عظیم آبادی کے ایک شعر کو بار بار پڑھوایا گیا۔

خلوت دل میں کبھی شمع مسرت نہ جلی
ایک خوشی آتی ہے جب سینکڑوں غم آتے ہیں

دوستوں کا خیال ہے سلطان اختر غزل کے مہاجن ہیں۔آج ان کی وضع قطع بھی بتا رہی ہے -----

-----کرتے کے اوپر چادر -----

میرے ہمراہ کڑی دھوپ کا سناٹا تھا
مجھ کو دیکھا تو گھنی چھاؤں پسِ دشت ہوئی
پھیل کر ٹوٹ گیا منظر و معنی کا طلسم
بات تفصیل میں جانے ہی سے دو لخت ہوئی

سلطان اختر کی غزل اور اس پران کا ترنم -----

اوراب ظہیر صدیقی اپنی غزل سنا رہے ہیں۔

حملے چہار سمت سے ہم پر ہوئے مگر
اندر سے جتنے وار ہوئے زیادہ سخت تھے
سوئے تو یاد قوسِ قزح بن کے چھا گئی
جاگے تو جتنے رنگ تھے وہ لخت لخت تھے

ظہیر صدیقی کے بعد مظہرامام سے کچھ سنانے کی فرمائش کی گئی۔

مظہرامام نے کہا میں ایک نظم سناتا ہوں۔عنوان ہے -----'آنگن میں ایک شام'

نظم پر کوئی تبصرہ نہیں ہوا۔

اوراب دوسرا دور شروع ہو چکا ہے۔متین الحق عمادی،سلطان اختر،شکیب ایاز اور ظہیر صدیقی نے دوبارہ غزلیں سنائیں۔

میزبان نے کئی غزلیں سنائیں۔

انہیں یہ حق پہنچتا تھا آپ بھی میزبان بن کر دیکھ لیں۔

اوراب مظہرامام غزل پیش کررہے ہیں.........................

کہنے کو تو یہ لوگ قدح خوار رہے ہیں

یہ کیا مغنی صاحب کی طرف اشارہ ہے۔

قمراعظم ہاشمی کیوں نہیں؟

پوراا سکول ہے کیا۔

جتنی بھی ہو قیمت تو لگا دیکھئے اپنی

ہم حسنِ گراں کے ہی خریدار رہے ہیں

یہ حضرت مغنی کے طرف دارر ہے ہیں۔

ان قہقہوں سے شفیع جاوید کی بھوک کھل گئی -----'بھئی اب کھانا مانگو۔'

پلاؤ کی قابیں -----نان -----آلو کی قلیہ ----- میٹھے کی طشتریاں -----

تم تو صرف روٹیاں کھاتے تھے۔

یہ خوشبوئیں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں۔

تب ہاتھ دھلے۔کچھ رخصت ہوئے کچھ رہ گئے اور فرش دیر تک خالی خالی آنکھوں سے ایک کو نے کو تکتا رہا۔جہاں دو چار ملنگ بیٹھے تھے۔

احمد تبسم اُٹھتی ہوئی بزم کا آخر جام ثابت ہوئے۔

گرم ہونٹوں کی سلگتی ہوئی چنگاری سے
میرے جذبات کا ملبوس لہک جاتا ہے
خیمہ زن ہو نہ سکا میری امیدوں کا جلوس
وقت دیکھیں مجھے کس موڑ پہ پہنچاتا ہے

احمد یوسف شفیع جاوید سے پوچھ رہے ہیں۔

'کل کے گھوڑے پر تین سوکھے سہمے شاعر آسکتے ہیں۔'

شفیع جاوید،مظہرامام،ظہیر صدیقی اور سلطان اختر کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔سوکھے سہمے شاعر -----کہ ضخیم افسانہ ان کی طرف دیکھ لیتا ہے۔

شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ

عبدالمغنی جا چکے -----اعجاز سوری بھی ان کے ساتھ گئے

شبیر کے پاس تو سائیکل ہے۔

ظہیر صدیقی اور سلطان اختر کو بس میں جگہ مل گئی۔مظہرامام شفیع جاوید کے ساتھ ہوا کے دوش پر چل پڑے -----اوراب شکیب ایاز،احسان نظر،آفتاب ندیم اور احمد یوسف سڑک کے کنارے کسی گہری فکر میں غوطہ زن ہیں۔آج بھی گذر گیا ہم کل ملے تھے۔ہم کل ملیں گے۔تب ایک انجانی آواز نے انہیں چونکا دیا۔کل کی کسے خبر -----

احمد یوسف کی خاکہ نگاری

تعارف : دل کے قریں رہتے ہیں

'دل کے قریں رہتے ہیں' احمد یوسف کے اردو کے تیرہ مشاہیر کی شخصیت ، ان کے حالاتِ زندگی اوران کے علمی وادبی کارناموں کی دلکش تصویرکشی کا حسین مرقع ہے۔ لہجے کی نفاست اورانداز بیان کا یہ عالم ہے کہ ان خاکوں کی اختصار وطوالت کی کیفیات کو درگزر کرکر آغاز واختتام تک مطالعے سے گزر جانے کے بعد ہی دل کو یک گونہ قرار آتا ہے۔ان خاکوں کی میرے خیال میں بڑی خوبی یا افادیت یہ ہے کہ ان کے توسط سے وہ نسلیں جنھوں نے براہِ راست ان شخصیات کی دید اوران کی صحبت کا شرف حاصل کیا اور جو ابھی خیر سے باحیات ہیں انھیں ان کے تئیں مزید معلومات کا اگر وسیلہ دستیاب ہوگیا ہے تو بعد کی نسلوں کے لئے کتاب کے مشمولہ مضامین تاریخی حیثیت کے حامل بن گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو درحقیقت یہ ان کے اکابرین سے ان کے بالواسطہ رابطے کا دلچسپ واطلاعاتی سامان ہیں۔ان خاکوں کوتحریر کرنے میں احمد یوسف کا بڑا کمال یہ ہے کہ مذکورہ شخصیتوں کے ساتھ گزارے ہوئے اپنے ایّام کو انھوں نے اپنے دل ودماغ میں جہاں محفوظ رکھا وہیں ان کے روز افزوں کے معمولات ومعاملات ،تعلیمی لیاقت اور معاشی مشاغل کے علاوہ ان کی اخلاق مندانہ جہتوں کو تحریری اعتبار سے محفوظ کئے جانے کے عمل کو اپنے ادبی فرائضِ منصبی میں شمار رکیا۔

'دل کے قریں رہتے ہیں' کے مشمولہ خاکوں میں نمبر شمار کے مطابق پہلا مضمون بزرگ محترم (فصیح الدین بلخی) کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔احمد یوسف نے مذکورہ مضمون میں سرخی کے اعتبار سے 'بزرگ محترم' تحریر کر جہاں ان سے اپنی قلبی وابستگی کا ثبوت پیش کیا ہے وہیں ان کی ہمہ جہت شخصیت کے

آئینے میں ان کے شخصی، علمی وادبی خدوخال اجاگر کرنے میں گہری فراخدلی کا ثبوت پیش کیا ہے۔خاکہ نگار نے ان کے مختصراً حالات زندگی تحریر کرنے کے بعد ان کے کارناموں کے تفصیلی احوال پیش کئے ہیں۔ سلسلۂ تعلیم کی حصولیابیوں کے بعد پونا ملٹری اسکول کی معلّمی سے چل کر مختلف ملازمتوں سے گزرتے ہوئے آخرش پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ مخطوطات کے ناظم کے عہدے سے ان کی سبکدوشی تک کا قصہ بہ آسانی ہماری فہم کا حصہ بن جاتا ہے۔اردو تحقیق میں فصیح الدین بلخی کی ایک بڑی حیثیت ہے اور تاریخ مگدھ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔انشاد شاد، تذکرۂ نسوانِ ہند، تذکرہ ہندو شعرائے بہار، رسائل میں شائع شدہ علمی وادبی مضامین کی فہرست، چندر یڈیوٹاک کی اطلاع، غیر مطبوعہ تصانیف مثلاً علم نجوم، تحریکِ وہابیہ بہار میں، آثارِ بلخیہ، آثارِ قدیمہ اور دستورِ سخن وغیرہ کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ فصیح الدین بلخی کا نسب نامہ شامل کر کے خاکہ نگار نے مشقتوں سے ان کے سلسلے کا ایک بڑا اطلاعاتی خزینہ ہمارے سپرد کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔فصیح الدین بلخی ۱۰رفروری ۱۸۸۵ء کو اس جہان میں آئے اور ۱۴رمارچ ۱۹۶۲ء کو اسے خیر باد کہا۔

'نامرادانہ زیست کرتا تھا' کے عنوان سے تحریر کیا گیا خاکہ عظیم آباد کے مشہور استاد شاعر ثاقب عظیم آبادی کے حالاتِ زندگی پر مبنی ہے۔متذکرہ شاعر ۱۸۹۸ء میں محلّہ شاہ کی املی کی خاک سے اٹھے تھے اور یہ وہ دور تھا جب شادؔ اور آزادؔ کی بساط جمی تھی۔ جناب ثاقب عظیم آبادی کی ۱۹۲۳ء میں پٹنہ سیٹی گورنمنٹ ہائی اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے تقرری ہوئی تھی۔

شاعری میں ان کا رنگ نشاطیہ تھا۔انھوں نے فن خطاطی باقی عظیم آبادی سے سیکھا تھا۔ثاقب عظیم آبادی کے زمانے میں مشاعرے یا تو بزرگ شاعروں کے گھر ہوا کرتے یا پھر کسی رئیس کے دیوان خانے میں۔آپ کا ایک اہم علمی کارنامہ یہ رہا کہ آپ نے حضرت رکن الدین عشق دہلوی ثم عظیم آبادی کا گم شدہ کلام فتوحہ کی خانقاہ سے برآمد کیا اور ایک خوبصورت انتخاب مع مقدمہ اور حالاتِ زندگی تحریر کر 'یادگار عشق' کے نام سے شائع کیا ہے۔اس خاکہ کے مطالعہ سے ثاقب عظیم آبادی اوران کی شعری حیثیت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کیونکہ ان کے کئی رنگ کے اشعار ہمارے ملاحظہ میں چلے آئے ہیں۔۱۹رجنوری ۱۹۷۴ء کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ثاقب کے شاگردان میں رمز عظیم آبادی،

شکیب ایاز، حسن امام درد، تاج پیامی اور ان کے صاحبزادہ سعید رضا گہر وغیرہ کا بطور خاص یہاں ذکر دستیاب ہے۔

’برق وشرر کو کیا ہوا‘ کی سرخی کے ساتھ تحریر شدہ خاکہ معروف شاعر پرویز شاہدی سے متعلق ہے۔ خاندانی حالات کے سلسلے میں خاکہ نگار نے یہ باور کرایا ہے کہ شہر کے ایک بڑے رئیس سید احمد حسین ان کے والد تھے۔ اس کے علاوہ یہ اطلاع بھی ہمارے لئے اہم ہے کہ حسن نعیم پرویز شاہدی کے کزن تھے۔’احمد منزل‘ کا بھی خاکہ میں بطور خاص ذکر کیا گیا ہے کہ وہاں فرش پر خوبصورت جاجم بچھی ہوتی تھی، کمرے ہوادار تھے اور ان کی دیواروں پر مقامات مقدسہ کی تصاویر تھیں۔

سید اکرام حسین (پرویز شاہدی) ۱۹۱۰ء میں لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی سفر کے ساتھ ملازمت میں اسکول ماسٹر سے کالج کے پروفیسر بننے تک کا قصہ رقم کرتے ہوئے ان کی سیاسی سرگرمیوں مثلاً بکسر جیل میں بھوک ہڑتال اور خانہ سلاسل کی سختیوں کا بھی ذکر اس خاکے میں کیا گیا ہے۔ شاعری میں عین الہدیٰ ثمر آروی کو ابتداء میں دو چار غزلیں دکھائیں۔ آٹھ سال کی عمر سے شاعری کی اور دس سال کی عمر سے باضابطہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ دو تین اشعار بھی اس خاکے میں تحریر کئے گئے ہیں۔

’پرکھ نہ پائے گا یہ لعلِ شب چراغ کوئی‘ کے زیر عنوان تحریر کیا گیا خاکہ مشہور افسانہ نگار اختر اورینوی کے حالاتِ زندگی کا احاطہ کرتا ہے جہاں سے ان کے تعلق کی کئی اہم اطلاعات ہمارے ملاحظے میں آتی ہیں۔

ویسے خاکہ نگار نے خاکے کا آغاز اختر اورینوی جیسے پایہ کے افسانہ نگار کے عین شایان شان تحریر کیا ہے۔ مثلاً اس کا آغاز ان کے افسانہ ’کلیاں اور کانٹے‘ کے ایک دلچسپ اور حسین جملے سے ہوتا ہے، ’’ہر صبح آٹھ نرسیں اُدھر سے آتیں اور ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھیں۔‘‘

اختر اورینوی نے سینی ٹوریم میں علالت کے سبب اپنے ایاّم بسر کئے تھے جس کا حاصل یہ رہا کہ انھوں نے سینی ٹوریم کو اپنے فن میں وسعتِ نظر کے ساتھ مقام عطا کیا۔ خاکہ نگار نے اس امر کی مناسبت

سے مذکورہ افسانہ سے خاصا مواد برآمد کیا ہے۔

۱۹/ اگست ۱۹۱۰ء کو کاکو میں ان کی پیدائش سے روشناس کراتے ہوئے ان کی تعلیمی حصولیابیوں کے بعد پٹنہ کالج میں ’دربارِ اختری‘ کے قیام کا انھوں نے دلچسپ قصہ پیش کیا ہے جہاں ضمناً ادب کی کئی بڑی شخصیتوں مثلاً رضا نقوی واہی، ڈاکٹر محمد محسن اور سہیل عظیم آبادی وغیرہ کے نام نامی چلے آئے ہیں۔ اختر اورینوی کی زوجہ اور مشہور افسانہ نگار شکیلہ اختر کے ساتھ مظہر امام بھی اس خاکے کا حصہ بنے ہیں۔

’مرشدی ومولائی‘۔ یہ خاکہ بہار کی ایک نہایت مشہور شخصیت جناب تقی رحیم پر مبنی ہے۔ وہ بیک وقت ادیب بھی تھے اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے ایک بڑے دانشور بھی تھے۔ ان کی معرکتہ الآرا تصنیف ’تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ‘ ہے۔ خاکہ نگار کے ان سے چالیس برسوں کے مراسم رہے اور انھیں تقی رحیم اس طور پر عجیب لگے کہ وہ مارکسسٹ ہونے کے باوجود اکثر سیاسی گتھیوں کو اسلامی تاریخ کی مدد سے سلجھانے کی کوشش کرتے، یہی نہیں وہ صحت مند ہوتے تو رمضان کے روزے پابندی سے رکھتے ۔نمازیں اکثر چھوٹ بھی جاتیں لیکن وہ نمازیں پڑھتے تھے۔ تقی رحیم کا سن پیدائش ۱۹۱۹ء ہے اور سن وفات ۵ مارچ ۱۹۹۹ء ہے۔ اس خاکہ میں تقی رحیم کی وضع قطع سے لیکر ان کی ادبی و سیاسی سرگرمیوں کے دلچسپ قصے گہری توجہ کے ساتھ پڑھے جانے کے قابل ہیں۔

’پا پیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی‘۔ یہ عنوان ہے احمد یوسف کے اس خاکے کا جو مشہور شاعر حسن نعیم پر مبنی ہے۔ یہاں انھوں نے ان سے متعلق ربع صدی کی یادوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ حسن نعیم سے ان کے رابطے کا سفر محمڈن اسکول اور علی گڑھ سے نکل کر رشتہ داری کی حدود میں داخل ہو کر تمام ہوتا ہے۔

حسن نعیم کی مختلف ملازمتوں کے احوال، ان کی مہمان نوازی، ان کے خاندانی حالات، اولاد کا غم اور صوفیاء و مشائخ سے خاندانی اعتبار سے ان کی نسبت جیسی اطلاعات کو خاکہ نگار نے نہایت دلکش و دلچسپ انداز میں عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ اطلاع بھی اہم ہے کہ حسن نعیم مشہور اشتراکی شاعر پرویز شاہدی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے حسن نعیم کی گہری وابستگی رہی بلکہ ان کی ایک غزل کو تو IPTA والوں نے اکثر عوامی جلسوں میں سنایا بھی ہے۔ اس خاکہ میں مذکورہ غزل کے تین

اشعار تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ حسن نعیم کی غزلوں اور نظموں کے کچھ اور نمونے بھی یہاں دستیاب ہیں۔

'نہ کوئی لطف سماعت نہ کوئی لذتِ دید'۔ اس عنوان سے تحریر کیا گیا خاکہ معروف شاعر مظہر امام کے قصے بیان کرتا ہے۔ پٹنہ ریڈیو میں ۱۹۶۷ء میں مظہر امام گوہاٹی سے تبدیل ہوکر پروگرام ایکزیکیوٹیو کی حیثیت سے آئے تھے اور عرصہ بعد خاکہ نگار کی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس زمانے میں سہیل عظیم آبادی بھی پٹنہ ریڈیو میں اردو پروڈیوسر کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ اس خاکہ میں مظہر امام کا خاندانی پس منظر، وطن عزیز دربھنگہ کی کشادہ رہائش اور پٹنہ کی دو کمروں کی سمٹی ہوئی ان کی زندگی کے احوال کے بعد یہاں یہ اطلاع بھی دلچسپ ہے کہ شاعری کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے تھے اور ۱۹۴۸ء میں ان کا ایک افسانہ 'مضراب' کراچی میں شائع ہوا تھا مگر مظہر امام کی بنیادی شناخت شاعری سے ہے اور وہ انھوں نے ۱۹۴۳ء سے ہی شروع کر دی تھی۔

مظہر امام نے ۱۹۵۱ء میں دربھنگہ سے بی۔اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ کلکتہ چلے گئے اخبار میں ملازمت کی۔ اس کے بعد اسکول سے وابستہ ہوئے۔ آخر میں ریڈیو کی نوکری سے وہ لگے تھے۔ متذکرہ خاکہ میں مظہر امام کے حوالے سے غیاث احمد گدی، پرویز شاہدی، حسن نعیم، حسن امام درد، منظر شہاب، کلام حیدری، بشیر بدر اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کی شمولیت بھی قابلِ ذکر ہے۔ آخر میں مظہر امام کی نظموں کے ساتھ ان کے اشعار بھی رقم کئے گئے ہیں۔

''مگر جہاں سے یہ بڑھ گیا وہیں پر آواز جل گئی ہے''۔ یہ عنوان اس خاکے کا ہے جو احمد یوسف نے ظہیر صدیقی سے متعلق تحریر کیا ہے۔

ظہیر صدیقی سے خاکہ نگار کی جذباتی وابستہ رہی ہے جن کے بارے میں ان کا خیال یہ ہے کہ ظہیر ان کے ان دوستوں میں ہیں جو اگر نہ ملتے تو زندگی میں کمی رہ جاتی۔ اپنی ان کی ملاقات کا سن ۱۹۶۶ء بتایا گیا ہے۔ ظہیر صدیقی دو برس کی عمر میں ماں سے اور بارہ برس کی عمر میں باپ سے محروم ہو گئے تھے۔ مشفق چچا نے ان کی پرورش و پرداخت کی۔ ظہیر صدیقی نے ۱۹۵۴ء میں ہائی اسکول کیا مگر مالی مشکلات کے سبب کالج کا منہ نہ دیکھا۔ ان کی ملازمت کا قصہ یہ ہے کہ وہ ۱۹۵۵ء میں پٹنہ کے جنرل اسپتال میں

کلرک کی ملازمت سے لگے اور ۱۹۶۴ء میں L.I.C سے وابستہ ہوئے۔ اس درمیان انھوں نے پرائیوٹ طور پر آئی۔اے سے لیکر ایم۔اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ ظہیر صدیقی کی نجی زندگی کے احوال کے علاوہ مذکورہ خاکہ میں ظہیر صدیقی کے نظموں کے تعلق سے طریقۂ کار کے سلسلے میں خاکہ نگار نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے کہ وہ اپنی نظم کے آخری سرے پر غزل کا ایک شعر دے کر نظم کو وسعتِ معنیٰ عطا کر دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر کی حیثیت سے ان کے شعری رنگ و آہنگ کے کئی نمونے یہاں پیش کئے گئے ہیں۔ یہی نہیں شخصی اعتبار سے ان کے کردار و اطوار بھی اس خاکہ کے مطالعے سے ہم پر عیاں ہوتے ہیں۔

'قصہ گو تھا فسوں طراز بھی تھا'۔ احمد یوسف کے اس خاکے کا محور و مرکز مشہور افسانہ نگار غیاث احمد گدی ہیں۔ احمد یوسف کے ساتھ غیاث احمد گدی کے علاوہ مشہور افسانہ نگار کلام حیدری کے اشتراک سے اردو افسانے کی ایک تثلیث قرار پائی تھی۔ اس خاکہ کے تعلق سے غیاث احمد گدی کے افسانے کی اشاعت کے بعد کلام حیدری کی اس تلاش کا ذکر کیا گیا ہے جس کے بعد ان کے جھریا قیام کی بات سامنے آئی تھی۔ خود خاکہ نگار یعنی احمد یوسف نے ان سے اپنی ملاقات کا سن عیسوی ۱۹۶۶ء تحریر کیا ہے جو شفیع جاوید کے یہاں ممکن ہو سکی تھی۔ اس کے بعد ان کی قربت کا یہ عالم رہا کہ وہ جھریا سے نکل کر گیا اور پھر پٹنہ چلے آتے اور زیادہ تر ان کا قیام احمد یوسف کے گھر ہی ہوا کرتا۔

غیاث احمد گدی کی شخصیت کے سلسلے میں احمد یوسف کا خیال یہ ہے کہ وہ سیدھے سادے، خوش مزاج اور بہت جلد گھل مل جانے والے تھے۔ اردو کے علاوہ بنگلہ اور ہندی فکشن کا بھی انھوں نے خاصا مطالعہ کیا تھا۔ رہا سوال بنگلہ کا تو انھوں نے اس کا مطالعہ ہندی کے توسط سے کیا تھا۔ غیاث احمد گدی کے پہلے افسانوی مجموعہ 'بابا لوگ' کے سن اشاعت کے علاوہ ان کے ڈھیروں افسانوں کے قصے اور مختلف رسائل میں ان کی اشاعت کے احوال ہمیں اس خاکے سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ کلام حیدری سے ان کی مثالی دوستی کی باتوں کے ساتھ ساتھ جھریا میں ان کی قیام گاہ پر اپنی ۱۹۷۶-۷۷ء کی حاضری کا دلچسپ واقعہ بھی بطور خاص احمد یوسف نے اس خاکہ میں پیش کیا ہے۔ آخر میں ۲۵ رجنوری ۱۹۸۶ء ان کا سالِ وفات درج ہے۔

'زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا'۔ احمد یوسف کا یہ خاکہ ان کے عزیز دوست کلام حیدری

سے متعلق ہے۔ کلام حیدری کے سلسلے میں انھوں نے اپنے خاکہ میں تحریر کیا ہے کہ ان سے میری پہلی ملاقات پیپلس پبلشنگ ہاؤس میں ہوئی تھی۔ کلام حیدری نے رانچی سے بی۔اے۔آنرس کیا تھا اور پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا تھا۔۱۹۷۱ء میں انھوں نے مگدھ یونیورسٹی سے لاء کی ڈگری لی تھی۔ وہ پورنیہ کالج میں لکچرر کے عہدے پر فائز رہے۔ کلام حیدری کے پہننے اوڑھنے کے تعلق سے ان کی نفاست پسندی سے لیکر اپنے ساتھ کھانے والے کے ساتھ ان کی وضع داری، دوستوں کے ساتھ ان کی دوستی اور پھر ان کے جھگڑ جانے کا عالم، چاہے کتنا بھی زیاں کیوں نہ ہو ایمانداری پر قائم و دائم رہنا وغیرہ ایسے اہم اور دلچسپ قصے ہیں جو اس خاکہ کے توسط سے ہماری توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ مظہر امام اور غیاث احمد گدی سے بھی ان کی کبھی ٹھن گئی تھی۔

آہنگ، مورچہ اور کلچرل اکیڈمی کی ادبی محاذ پر کلام حیدری کے دم سے کتنی فعالیت تھی اس کا بھی اندازہ اس خاکہ کے مطالعے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ کلام حیدری کے مشمولہ کئی افسانوں کے اقتباسات ان کے افسانے کے مزاج و معیار کا پتہ دیتے ہیں۔ کلام حیدری نے آزادی سے قبل لکھنا شروع کیا تھا۔ کلام حیدری، شیخ پورہ ضلع مونگیر کی خاک سے ۱۹۳۰ء میں اٹھے تھے اور ۳ فروری ۱۹۹۴ء کو گیا کے گیوال بیگہ قبرستان کی خاک کی نذر ہو گئے۔

’تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد‘ یہ عنوان ہے احمد یوسف کے اس خاکے کا جو اردو کے معتبر ناقد وہاب اشرفی پر مبنی ہے۔ اس خاکے میں وہاب اشرفی سے خاکہ نگار کی ملاقات کا عہد ۶۴۔۱۹۶۲ء تحریر کیا گیا ہے اور یہ ملاقات تقی رحیم کے ذریعہ عمل میں آئی تھی۔ وہاب صاحب کی بی بی پور (کاکو) سے نسبت کے علاوہ ان کے والد ماجد کے نام سے گزرتے ہوئے ان کے تفصیلی تعلیمی احوال سے بخوبی ہم واقف ہو جاتے ہیں۔ وہاب اشرفی کا سن پیدائش ۲ جون ۱۹۳۶ء ہے۔ یہاں ایک دلچسپ اطلاع یہ ہے کہ وہاب صاحب کی طرح احمد یوسف بھی کبھی سگریٹ پیا کرتے تھے۔

وہاب اشرفی کے ادبی قصے، رانچی یونیورسٹی کے ہیڈ ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر عہدوں پر ان کے فائز ہونے کے احوال کے علاوہ ان کی دعوتوں کے اہتمام بھی اس خاکے کے توسط سے ہماری توجہ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ حسن نعیم، سہیل عظیم آبادی، مظہر امام، عبدالصمد، کلام حیدری، غیاث احمد گدی اور جابر

حسین وغیرہ کے اذکارِ خاص مختلف واقعات کے ساتھ اس خاکے میں رقم ہیں۔ وہاب اشرفی کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست بھی یہاں موجود ہے۔

’میں نے اندھیری شب کو نجوم و قمر دیا‘۔ اس عنوان سے نادم بلخی سے متعلق خاکہ نگار نے اپنا خاکہ تحریر کیا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے دوبارہ قائم ہونے اور ہر ہفتے اس کی نشستوں کے ہونے کے تعلق سے کئی شاعروں اور ادیبوں کے نام کے ساتھ نادم بلخی کا نام بھی لیا گیا ہے۔ اطلاع کے مطابق ۱۹۳۹ء میں محمڈن اسکول کی ساتویں جماعت میں خاکہ نگار کے ساتھ وہ بھی شامل تھے۔ نادم بلخی علم و فن کے بڑے ستون فصیح الدین بلخی کے فرزند تھے جن کی حیثیت یہ تھی کہ وہ شعر و شاعری، صرف و نحو اور علم و عروض کے سلسلے سے مقبول تھے۔ نادم بلخی نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا اور ڈالٹین گنج میں اردو کے لکچرر ہو گئے۔ یہاں ایک اہم اطلاع یہ دستیاب ہے کہ وہ اور احمد یوسف ایک ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہوئے تھے اور ایک دفعہ گھر پر RAID کے امکان کے پیش نظر انھوں نیبھی تقی بلخی کے گھر رات بسر کی تھی۔ اس خاکہ میں خاکہ نگار نے ۱۹۵۱ء میں کلکتہ میں منعقد کل ہند ’کلچر برائے امن‘ کانفرنس کا بھی ذکر کیا ہے جس میں ان لوگوں نے شرکت کی تھی۔ مذکورہ کانفرنس میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مجاز نے بھی شرکت کی تھی۔ نثری و شعری کارناموں کے ساتھ نادم بلخی کے خاندانی احوال سے بھی اس خاکہ کے توسط سے بخوبی ہماری آشنائی ہو جاتی ہے۔

احمد یوسف کی مذکورہ کتاب کے خاکوں کے سلسلے کا آخری خاکہ ’میرے ابّا‘ کے زیر عنوان تحریر کیا گیا ہے۔ خاکہ نگار کے والد محترم سید محمد یوسف کی شخصیت یہ تھی کہ خاندانی کاروبار سے وابستگی کے باوجود علمی و ادبی اعتبار سے ان کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے جس کی عمر اس گھڑی بمشکل سات آٹھ سال رہی ہوگی، اسے اقبال کی نظم ’شکوہ‘ ، ’جواب شکوہ‘ کے علاوہ اکبرالہ آبادی اور ظفر علی خاں وغیرہ کی نظمیں یاد کرایا کرتے۔ سید محمد یوسف نے سائنس سے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر آرٹس میں گئے اور بی۔اے و ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد قانون کی ڈگری لی، پٹنہ میں کچھ دن پریکٹس بھی کی مگر وہاں ان کا دل نہ لگا۔

ان کے ادب پڑھنے کا قصہ یہ ہے کہ انھوں نے فارسی و اردو کی تمام کلاسیکی شاعری کے ساتھ

انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل کے سارے انگریزی، روسی اور فرانسیسی ناول پڑھ ڈالے تھے۔ اقبال کی نظموں کے علاوہ نظیر کی بنجارہ نامہ کا انھوں نے انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اسی طرح ورڈسورتھ اور ٹینی سن کی کئی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔

تاریخ گوئی پر انھیں بڑی مہارت تھی۔ پرویز شاہدی کی وفات سے لے کر جگر، ڈاکٹر ذاکر حسین اور غلام سرور کی والدہ وغیرہ پر ان کی اس نوع کی کاوش کے مختصر نمونے اس خاکہ کے آخری حصّے میں موجود ہیں۔

’دل کے قریں رہتے ہیں‘ کے مشمولہ خاکے یہاں تمام ہو جاتے ہیں۔ احمد یوسف نے انھیں تحریر کرنے کے عمل میں اپنے تخلیقی اسلوب سے بڑا کام لیا ہے اور یہی سبب ہے کہ دورانِ مطالعہ مطالعہ گر کی توجہ برقرار رہتی ہے۔ ان کے خاکوں کے سلسلے سے ایک خاکہ بعنوان ’قصہ گو تھا فسوں طراز بھی تھا‘ جو غیاث احمد گدی سے متعلق ہے اس خیال کے پیش نظر شامل کیا جا رہا ہے کہ کوئی جو چاہے اگر تو ایک مکمل خاکے کے توسط سے ان کے فن کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکے۔

قصہ گو تھا فسوں طراز بھی تھا

(دل کے قریں رہتے ہیں سے منتخب غیاث احمد گدی کا خاکہ)

آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک میں انتہا پسندانہ رجحانات اس طرح در آئے تھے کہ اشتراکی حقیقت نگاری کے نام پر نئی صبح، سرخ سویرا اور ایک روشن دن کا بے محابا استعمال ہونے لگا تھا۔

مزدوروں کی اقتصادی جنگ، اسٹرائیک اور تالا بندی۔ یہ ہمارے افسانے کے مخصوص موضوعات تھے۔

’’شاہراہ‘‘ میں ایک افسانہ شائع ہوا۔ ایک روپوش اشتراکی رہنما، جس کے پیچھے پولس لگی ہے۔ رات کے وقت دریا کی طرف فرار ہو رہا ہے، جہاں اس کے لئے ایک کشتی کا انتظام ہے۔ راہ میں ایک خفیہ کا آدمی اس سے ماچس مانگتا ہے اور اس طرح اس کی شناخت کر لیتا ہے۔

احمد ریاض کا یہ افسانہ خاصا Click کر گیا، اور اسے بڑی شہرت ملی۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا برِاعظم میں اس وقت یہ صورت حال پیدا ہو چکی تھی؟

بیشتر افسانوں میں ایک ہی جیسی فضا نظر آتی، تب ہی یہ بحث چل کھڑی ہوئی کہ کیا ادب جمود کا شکار ہے؟ ایسے میں ’’شاہراہ‘‘ کے اگست ۱۹۵۱ء کے شمارے میں غیاث احمد گدّی کا افسانہ ’’ڈورتھی جون سین‘‘ شائع ہوا تو ہم بس اس افسانے کی تاریکی، موضوع کی ندرت اور خوبصورت طرز تحریر سے بے حد متاثر ہوئے۔

’’لڑکی اٹھ اس پستی سے اٹھ...... ! یسوع مسیح کی آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی..... لڑکی.......اٹھ.....‘‘

(ڈورتھی جون سین/ بابا لوگ، ص۔۱۵۲)

لیکن یہ صاحب ہیں کون؟ کلام حیدری نے غیاث احمد گدی کی تلاش شروع کر دی اور بالآخر

ایک دن انھوں نے ہمیں یہ خبر بہم پہنچائی کہ غیاث جھریا کے رہنے والے ہیں۔ ان سے ان کی رانچی میں ملاقات ہوئی تھی، اور یہ کہ وہ مسلسل لکھ رہے ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ ان کے افسانے ہمایوں، چندن اور شاعر وغیرہ میں چھپ چکے تھے، لیکن ''ڈورتھی جون سین'' نے ہمیں پہلی بار چونکایا تھا۔ ویسے ان سے عرصے تک ملاقات نہیں ہوئی۔

پھر ۱۹۵۹ء میں ''صنم'' کے ''بہار نمبر'' میں ان کا افسانہ ''افعی'' شائع ہوا تو اس نے ایک بار پھر ہمیں بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ محسوس ہوا کہ افسانہ ابھی زندہ ہے، یوں افسانے تو بہت لکھے جا رہے تھے، لیکن وہ ہمیں اپنی گرفت میں نہیں لیتے تھے۔

''میں کبھی نہیں بھولتی مشتاق صاحب اسے۔ ہر وقت وہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے..... اس نے برانڈی کا ایک بڑا سا پیگ لیتے ہوئے کہا۔ جانتی کہ جانے والا ایسے چلا جائے گا، تو راستہ روک لیتی۔ یہ جسم ..... یہ مٹی ..... یہ ہے قیمتی چیز، اب اگر وہ کہیں سے آ جائے تو میں سب کچھ اس کے قدموں پر ڈال دوں.....''

(افعی/ پرندہ پکڑنے والی گاڑی، ص۱۱۴)

''افعی'' میں مجھے ایک مختلف سی دنیا ملی۔ اس کے Treatment میں توازن، ایسی فنی چابکدستی دکھائی دی کہ میں نے سوچا کہ اب اگر میں غیاث کو خط نہیں لکھوں گا، تو اس ماہر قصہ گو کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی، چنانچہ میں نے غیاث احمد گدی کو خط لکھ کر، اس خوبصورت افسانے کی اشاعت پر مبارکباد دی۔

غیاث کا کوئی جواب نہیں آیا۔ لیکن جب میں ان سے پہلی بار ۱۹۶۶ء کے آس پاس شفیع جاوید کے یہاں ملا، تو انھوں نے بتایا کہ وہ خط انھیں موصول ہوا تھا۔

''بابا لوگ'' کو ترتیب دینے لگے، تو میں نے بھی اپنے طور پر ان کے دس بارہ افسانوں کی فہرست بنا کر بھیجی تھی۔ اس فہرست کے بیشتر افسانے بابا لوگ میں شامل ہیں۔ ''ایک قیدی'' اور ''پاگل خانہ'' کو انھوں نے اپنے اگلے مجموعے کے لئے رکھ چھوڑا تھا، چنانچہ یہ افسانے ان کے دوسرے مجموعے ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' میں نظر آتے ہیں۔

غالباً ۱۹۷۰ء میں، میں نے ان کی افسانہ نگاری پر ایک مضمون لکھا تھا جو ''کتاب''، لکھنؤ میں

اشاعت پذیر ہوا تھا۔

غیاث سیدھے سادے آدمی تھے، خوش مزاج اور بہت جلد گھل مل جانے والے۔ ان کی گفتگو میں کبھی کوئی اینچ پینچ نہیں ہوتا، نہ ہی کبھی انھوں نے کوئی Intellectual Pose دیا۔

ان کا پہلا مجموعہ ''بابا لوگ'' ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا اور جنوری ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ ''آہنگ'' کا اجراء ہوا۔ ''آہنگ'' کلچرل اکیڈمی گیا کا آرگن تھا۔ یہ بڑا ہی فعال ادارہ تھا اور اس کی سرگرمیوں کے سبب یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان اطراف کے سبھی لکھنے پڑھنے والے ایک پلیٹ فارم پر آ گئے ہیں۔ کلام سال میں دو ایک بار اس کے جلسے بلاتے، اس طرح بہار کی ادبی دنیا میں بڑی زندگی آ گئی تھی۔ ''مورچہ'' ۱۹۶۲ء سے نکل رہا تھا۔ وہ ہفتہ وار تھا اور اس میں سیاسی، نیم سیاسی اور نیم ادبی موضوعات شائع ہوا کرتے تھے۔ ''بابا لوگ'' کی اشاعت کے بہت پہلے سے اس کا اشتہار ''مورچہ'' میں آ رہا تھا۔ ''آہنگ'' کے اجراء کے بعد ''مورچہ'' بھی خاصا ادبی ہو گیا۔ کلام نے ''مورچہ'' اور ''آہنگ'' میں کچھ نظریاتی بحثیں چھیڑ رکھی تھیں۔

شفیع جاوید کے یہاں کی ملاقات کے بعد اب ان کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ جھریا سے گیا اور پھر گیا سے پٹنہ آتے تو بیشتر میرے ہی گھر پر قیام کرتے۔

دن کے اوقات میں وہ ریڈیو اسٹیشن یا کسی دفتر کی طرف چل دیتے۔ ادھر میں بھی اپنے کام پر لگ جاتا۔ شام کو ہم ملتے تو پھر باتیں شروع ہو جاتیں۔ افسانے، ناول، ادبی، خبریں۔ اردو کے علاوہ انھوں نے بنگلہ اور ہندی فکشن کا بھی خاصہ مطالعہ کیا تھا۔ بنگلہ کو انھوں نے ہندی ترجموں سے پڑھا تھا۔

کبھی کبھی کوئی ادبی بحث بھی چھڑ جاتی۔ ایک بار ناسٹلجیا (Nostalgia) کی بات آ گئی تو میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے افسانو میں ناسٹلجیا قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ غیاث کہنے لگے اگر دو چار افسانہ نگاروں کے یہاں ناسٹلجیا ہے تو ہم اسے قدر مشترک کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ میں نے مثالیں دیں، لیکن وہ ماننے کو تیار نہیں تھے، کہ اتنے ہی میں شفیع جاوید آ گئے، اور پھر دوسرے موضوعات پر گفتگو ہونے لگی۔

لیکن اگر میں نے کبھی کوئی مشورہ دیا تو اسے بڑی خندہ پیشانی سے مان لیتے۔ یاری صحبتوں میں اکثر ابا بھی آ جاتے۔ وہ غیاث کی گفتگو میں بڑا لطف لیتے تھے۔ ان سے افسانے کے فنی نکات کے متعلق پوچھتے۔ خود وہ پرانے واقعات سناتے۔ یا کبھی فرنچ ناولوں اور روسی ناولوں کا ذکر چھیڑ دیتے۔ شیکسپیئر کے

ڈرامے انھیں بہت یاد تھے، انھیں جابجا سناتے اور کبھی موڈ ہوتا تو حافظ، فردوسی اور خاقانی وغیرہ کا کلام سناتے۔

اکثر ہم لوگ رات کا کھانا کھا کر ٹہلنے نکل جاتے۔ گھر سے کوئی ایک کیلومیٹر پر ایک ریستوران تھا، وہاں جا کر چائے پیتے، اور پھر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں گھوم پھر کر گھر واپس آ جاتے۔ اسی رات کی چہل قدمی کے دوران غیاث نے مجھے ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' کی پوری کہانی زبانی سنائی تھی۔ انھیں افسانہ سنانے کا فن آتا تھا۔ اس افسانے نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ افسانے کا پورا نظام علامتی تھا، لیکن علامتیں ایسی تھیں جو بہ آسانی گرفت میں آ جاتی تھیں، اور انھیں Decode کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ پرندہ بلند نگہی اور بلند پروازی کا سمبل تھا۔ گاڑی Establishment کا وہ چکر تھی جو بلند نگہی اور بلند پروازی کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ وجہ صاف تھی کہ اسے اپنا وجود خطرے میں نظر آنے لگتا تھا۔ کلام کی کوٹھی کے گراؤنڈ فلور پر کلچرل اکیڈمی، ''آہنگ'' اور ''مورچہ'' کا دفتر تھا۔ یہ سبھی دفاتر ایک بڑے ہال میں تھے، جسے پارٹیشن دے کر انھوں نے دوسری طرف اپنا ڈرائنگ روم بنا لیا تھا۔ اس ہال کے دونوں جانب کئی Self Contained کمرے تھے جو بے حد آرام دہ تھے۔ ان کمروں کی حیثیت مہمان خانے کی تھی۔

غیاث یہیں کسی ایک کمرے میں آ کر قیام کرتے۔ قمیض پائجامہ، کرتا پائجامہ یا کبھی پینٹ شرٹ اور پاؤں میں چپل، ہاتھ میں ایک بیگ جس میں دو ایک افسانوں کے علاوہ ایک ٹوتھ برش اور کنگھی ہوتی اور اس وضع قطع میں وہ دور دور کی مسافت طئے کر لیتے۔

غیاث اور کلام کا تقریباً ایک سا ڈیل ڈول تھا۔ اسی لئے جب کلام کے یہاں قیام کے دوران اُن کے کپڑے میلے ہو جاتے تو وہ بھابھی کو ایک پرچی لکھ بھیجتے۔

اس پر وہ کلام کے کپڑے بھیج دیتیں، اور وہ اپنے جسم کے کپڑے لانڈری کو بھجوا دیتے۔

ایک بار وہ اسی وضع میں دہلی پہنچ گئے۔ فروری کا مہینہ تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ حسن نعیم، ان کی بیگم اور بچے برآمدے میں بیٹھے دھوپ کا لطف اٹھا رہے تھے۔ وہ لوگ سوئٹر اور شال میں تھے۔ اِدھر یہ صرف پینٹ شرٹ میں تھے۔ انھیں دیکھ کر غیاث صاحب نے کہا:

''آپ لوگوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ فروری میں سوئیٹر اور شال؟'' ان کے ذہن میں جھریا کا

موسم تھا۔

حسن نعیم نے کہا۔ ''ہم لوگ تو ٹھیک ہیں، لیکن کچھ دیر بعد آپ کی طبیعت خراب ہونے والی ہے''۔ اور ہوا یہی کہ جب دھوپ ڈھلنے لگی تو غیاث کو سردی کا احساس ہونے لگا، چنانچہ ان کے لئے سوئٹر وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔

غیاث اور کلام دونوں ایک دوسرے کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ان کا کچھ کاروباری رشتہ بھی تھا۔

غیاث نے اپنا پہلا مجموعہ ''بھابھی'' بیگم شاہدہ حیدری کے نام معنون کیا تھا، دوسرا منی بائی کے طوطے کے نام اور تیسرا مجموعہ کلام حیدری کے نام۔ پینتیس چھتیس سال کی یہ دوستی بڑی مثالی دوستی تھی۔ اتفاق سے ایک باران کی اَن بن ہوئی۔ غیاث نے کلام کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ لیکن جب رینا کی شادی میں کلام نے غیاث کو کارڈ بھیجا تو وہ اس طرح آئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ دل کی تختی کوری کی کوری تھی۔

ایسے سادہ دل شخص کو لوگ گھیرے رہتے۔ پٹنہ خط لکھ دیجئے۔ امتحان کی کاپی کی سفارش، دفتر کی کوئی نوکری، سکریٹریٹ کا کوئی کام۔ غیاث مجھے لکھ بھیجتے اور میں ان کے کام میں لگ جاتا۔ کبھی ان کا کوئی فرستادہ میرے گھر بھی پہنچ جاتا۔

لیکن جب غیاث پٹنہ آنے لگے، تو انھیں یہاں کے فاصلوں کا اندازہ ہوا، اور اس طرح یہ سلسلہ ختم ہوا۔

انھیں افسانے کو تشکیل دینے کا فن آتا تھا۔ موضوع اور ہیئت کے بہترین امتزاج سے وہ افسانے کے تانے بانے بنتے۔ ایک واضح پلاٹ، کردار نگاری، فضا بندی، Suggestiveness ایک بے حد تخلیقی زبان اور ایک عمدہ طرز بیان۔ ان افسانوی اجزاء کے ساتھ میں افسانے میں Wit اور دلچسپی کا عنصر بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتا۔ افسانے میں ہمیں ایک بصیرت بھی ملتی۔ ''بابا لوگ''، ''پیاسی چڑیا''، ''تج دو تج دو''، ''کالے شاہ''، ''قیدی''، ''نارو مُنی''، ''اَفعی''، ''ایک بھیگا ہوا لب''، ''امام باڑے کی اینٹ''............ان سارے افسانوں میں ایک ایسا Finished Product آپ کو ملے گا، جس میں ایک ماہر قصہ گو نے کمال حسن و خوبی سے تناسب کا خاص خیال رکھتے ہوئے، ان سارے عناصر کو یکجا کر دیا ہے۔

۱۹۷۶ء، ۱۹۷۷ء کا قصہ ہے، میں ایک شادی میں آسنسول گیا ہوا تھا۔ واپسی میں جب ٹرین

کوئی ۴ بجے صبح دھنباد پہنچی تو بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں وہاں اُتر جاؤں، اور جھریا جا کر غیاث سے ملوں۔ کچھ بوئے دوست والی بات تھی۔ فتح پور میں پہنچا تو ابھی اندھیرا ہی تھا، اور گلی بالکل سناٹی تھی۔ ایک نوجوان مزدور دکان کے اوٹے پر سویا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر پوچھا:

''بھائی تم غیاث احمد گدی کو جانتے ہو؟''

اس نے کہا: ''غیاث میاں گدی۔ لکھتا ہے''۔

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں لکھتا ہے''۔

اس نے انگلی کے اشارے سے بتایا، ''وہ سامنے جو دروازہ دکھائی دے رہا ہے، اس کے بازو میں گھنٹی ہے، گھنٹی بجاؤ، وہ اوپر رہتا ہے''۔ یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گیا۔

غیاث نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ میں اس طرح منھ اندھیرے ان کے گھر پہنچوں گا۔ وہ بے حد خوش ہوئے۔ سویرے الیاس احمد گدی بھی آ گئے۔

ایک دن ان کے یہاں قیام رہا۔ دوسرے دن میں نے رانچی کا پروگرام بنایا، جہاں میرے بہنوئی کانکے میں رانچی ایگریکلچر کالج کے پرنسپل تھے۔

غیاث نے کہا۔ ''چلو میں بھی چلتا ہوں''۔

دوپہر کے قریب ہم لوگ رانچی پہنچے۔ غیاث ہمیشہ بازار میں شیو بنواتے تھے۔ رانچی کے مین روڈ پر انہیں ایک سیلون نظر آ گیا تو بولے ''چلو پہلے ذرا میں شیو بنوا لوں''۔

چھوٹا سا سیلون تھا، وہ اندر چلے گئے اور میں باہر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ غیاث کو دیکھا تو وہ باربر سے گفتگو میں محو تھے۔

اتنے میں باربر نے مجھے آواز دی۔ ''صاحب اندر ہی آ جایئے، یہاں کرسی خالی ہے''۔ میں اندر جا کر بیٹھ گیا۔ تب ہی میں نے محسوس کیا کہ باربر شیو بناتے ہوئے وقفے وقفے پر میری طرف بھی دیکھ لیتا ہے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

کانکے کی راہ میں، میں نے غیاث سے پوچھا ''یہ اچانک باربر کے رویے میں تبدیلی کیسے آ گئی''۔

غیاث نے کہا کہ باربر کے پوچھنے پر کہ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں، میں نے اسے بتایا کہ ان

صاحب کو لے کر کانکے جا رہے ہیں۔ ابھی تو یہ ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن ان پر بڑے سخت دورے پڑتے ہیں۔ تب ہی اس نے گھبرا کر تمہیں اندر بلوا لیا۔

مجھے بڑے زور کی ہنسی آئی۔ ''یہ کیا حرکت کی آپ نے''۔

غیاث نے غایت درجے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''تم خود ہی سوچو نا کہ کیا ہم سب لوگ پاگل نہیں ہیں، جو اس ملک میں لکھنے پڑھنے کا کاروبار کرتے ہیں''۔

غیاث نے بالکل سچ کہا تھا۔

۲۸ جنوری ۱۹۸۶ء کو جب میں ایک طویل سفر کے بعد پٹنہ واپس پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ غیاث قلب کے ایک شدید حملے کی تاب نہ لا کر ۲۵ جنوری کو اس دنیا سے سدھار گئے، ٹھیک تین دن پہلے یہ ایسا سفر تھا کہ وہ اپنا بیگ تک لے جانا بھول گئے۔ دوستوں سے ملے بغیر۔ بس اٹھے اور چل دیئے۔ یوں لگا کہ میرے دل پر کسی نے برچھی گھونپ دی۔ کئی دنوں تک عجیب حال رہا۔

مجھے اچانک ''تج دو تج دو'' کا ایک Sequence یاد آ گیا۔ ''کوئی زخمی پرندہ اڑتے اڑتے پھر سے الجھ گیا ہوگا''۔ (''تج دو تج دو'')

یہ واقعہ تو اکثر ہوا کرتا تھا۔ لیکن اسی بار تو اس عمل میں پرندے کی جان ہی چلی گئی۔

احمد یوسف کی ناولٹ نگاری

تعارف 'جلتا ہوا جنگل' :

احمد یوسف کے تین ناولٹ 'پستی کے مکیں'، 'گناہ آدم' اور 'جلتا ہوا جنگل' پر مبنی مجموعہ کا پہلا ناولٹ 'پستی کے مکیں' ہے۔ مذکورہ ناول میں ایک رواں قصہ ہے جو بیان ہونے کے مرحلے میں اپنی گہری معنویت اور دلکش اندازِ بیان کے سبب توجہ طلبی کے عین محور و مرکز میں رہتا ہے۔ احمد یوسف کا یہ ناولٹ موضوعاتی اعتبار سے اچھوتا یا انوکھا نہیں ہے کیونکہ اسے پڑھتے ہوئے غلام عباس کے افسانہ 'آنندی' کی یاد آجاتی ہے۔ ہاں کئی کرداروں کے اشتراک سے اپنے مخصوص اسلوب کو بروئے کار لا کر انھوں نے اپنے منتخب کردہ موضوع کو ندرت عطا کرنے کی بہت حد تک کوشش کی ہے۔ غلام عباس کا شہرہ آفاق افسانہ آنندی ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ جہاں بلدیہ کے اجلاس کے توسط سے مہذب سماج سے بیسواؤں کی زنان بازاری کو کسی دوسرے مقام پر منتقل کرنے کا معاملہ عمل میں آتا ہے اور شہر سے چھ کوس کی دوری پر ان کی دربدری کے لئے مقام کا انتخاب کیا جاتا ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں بھی کیف ونشاط کے رنگ وروغن سے بھرپور ایک پوری دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ اس نئے شہر کا باضابطہ نام 'حُسن آباد' قرار پاتا ہے جو بعد میں حسن آباد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بلدیہ کا اجلاس ایک دفعہ پھر طلب کیا جاتا ہے اور اس دفعہ بارہ کوس کی دوری پر ان کے رہنے کے لئے مقام مختص کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود متذکرہ مسئلہ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں ہمارے مہذب سماج کے دوہرے رویے کا عالم یہ ہے کہ ایک طرف تو معاشرہ و سماج کی بہتری کے لئے وہ اپنی سطح سے سنجیدگی کی تمثیل پیش کرتا ہے مگر دوسری جانب عملی اعتبار سے اس کا کردار اس کے منافی ہوتا ہے۔

اب جہاں تک احمد یوسف کے ۱۹۶۰ء کے تحریر کردہ ناولٹ 'پستی کے مکیں' پر نقد و نظر کا سوال ہے

تو اس ناولٹ کی ایک بڑی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ یہاں ٹھٹیری بازار کی زنان بازاری سے میرن کی گلی کے مہذب سماج میں منتقل ہوئی زلیخا بائی ہر چند کہ طوائف ہے مگر اس کے اندر جا بجا ایک پاکیزہ و پارسا عورت بیدار ہوتی ہے۔ وہ عورت جس کے دل میں کنور بلراج بہادر سے محبت کے حوالے سے اپنے گھر بار کی تمنائیں اور آرزوئیں تھیں۔ دو جسم اور دو روحوں کے میل کے باوجود کنور بلراج بہادر اس کے گھر برات نہ لا سکے تھے کہ کوٹھے سے اس کی نسبت تھی۔ کنور بلراج بہادر کی حسب مراتب شادی کے ساتھ ان کے ملنے ملانے کے دن تمام ہو گئے اور بالآخر وہ دنیا سدھار گئے۔ مگر اس کے باوجود زلیخا بائی کی کنور بلراج بہادر کے تعلق سے ماضی کی حسین یادوں کا عالم یہ ہے کہ وہ اس بات کا برملا اظہار و اقرار کرتی ہے کہ ان کی نتھ اُترائی کی عطا کردہ پانچ ہزار کی رقم کے بعد اس کے کتنے ہی خریدار آئے اور کتنے ہی سودے ہوئے مگر ان سے وابستہ جو سودا تھا وہ پہلا بھی تھا اور دل کا بھی تھا۔

اس نوع کے ایک طوائف کے چند کلمات یہاں گہری توجہ کے متقاضی ہیں جو اسے جسم کی سوداگری سے بالاتر محض ایک عورت کی پارسائی اور اس کی محبت کی نافراموش یادوں کے حوالے سے بطور سرمایہ تعبیر کئے جانے سے متعلق ہیں:

> ''ماضی کی ایک چھوٹی سی مدت، کچھ یادیں، سچ پوچھو تو یہی میرا سرمایہ ہے۔ کنور بلراج بہادر......کنور بلراج بہادر۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'پستی کے مکیں' ص ۱۳)

> ''تمہارے جانے کے بعد کتنے ہی خریدار آئے، کتنے ہی سودے ہوئے، لیکن سچ جانو یہ پہلا سودا دل کا تھا۔ باقی تو سب جسم کے سودے تھے، محض جسم کے۔ کنور بلراج بہادر ہم میں بھی پہلے عورت بیدار ہوتی ہے اور تب وہ مر کر طوائف کا روپ دھار لیتی ہے۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'پستی کے مکیں' ص ۱۲)

زلیخا بائی کے درج بالا کلمات میں یوں بھی صداقت کا رنگ دکھائی دیتا ہے کہ جب کبھی کسی موقع سے کسی طوائف سے اس کی پارسائی سے طوائف بننے کی بات ملاحظے میں آتی ہے تو عالم مجبوری سے قبل وہ راہِ محبت میں خالصتاً دل کے واسطے سے ہمیں آگاہ کرتی ہے دکھائی دیتی ہے۔

اس ناولٹ میں قصے کی اساس کی صورت بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسدادِ عصمت فروشی قانون کے نافذ ہونے کے بعد بدلی ہوئی صورت حال کے پیشِ نظر پیشہ ور عورتوں نے کوٹھوں سے اُتر کر جب محلوں میں پناہ لی تو محلے والوں نے اس پر زبردست اعتراض کیا۔

یوں ناولٹ نگار نے اس قصے کو فروغ دینے کی غرض سے کئی کرداروں کو وضع کیا اور ان کے خیالات و تصورات کے سہارے اپنے منشاء و مدعا تک رسائی حاصل کرنے کے عمدہ جتن کئے ہیں۔

یہاں ٹھیکیدار فضل کریم اور اس کے پرانے غمخوار عظیم الدین کا کردار یہ ہے کہ وہ اپنی کوششوں کے بوتے اپنا منافع جوڑ کر زلیخا بائی کے پیسوں سے ننھے نواب سے ایک مکان خرید کر زلیخا بائی اور اس کی مہہ جبیں و شبو نامی بھانجیوں کو ٹھٹھیری بازار سے میرن کی گلی میں لے آتے ہیں۔ بعد ازیں مہذب سماج میں مقام پانے کی غرض سے فضل کریم زلیخا کو اپنی منکوحہ بنالیتا ہے۔ مگر گڑبڑیاں چاہے جس طرز کی ہوں تا دیر پوشیدہ نہیں رہ پاتیں اور آخرش ابھر کر سامنے چلی آتی ہیں۔ چنانچہ جب ان کے دروازوں پر بڑے افسروں اور انجینئروں کی مخصوص نمبر کی کاریں نظر آنے لگیں، وہاں کارپوریشن کے ڈرم میں وہسکی کی بوتلیں دکھائی دینے لگیں، اوماشنکر کے بیٹے روی شنکر سے شبو اور مہہ جبیں سے ایک اڑھتئے کی وابستگی کے احوال عام ہونے لگے تو محلے والوں اور فضل کریم میں ٹھن گئی۔ حافظ متین اس بابت تصفیہ کے لئے بلائے گئے۔

یہ عمل فطری تھا جس میں محسن صدیقی کی بیٹھک میں لگے جمگھٹے کا بڑا رول ہے۔ وہیں سے میرن کی گلی میں نو وارد مشتبہ قسم کے افراد کے مکمل حالات سے روبرو ہونے کی خاطر ایک کمیشن کی تشکیل عمل میں آتی ہے جس کے ذمہ داران میں بشیر علی اور محمد نیاز کے کردار کی فعالیت قابل ذکر ہے۔ ویسے اس ناولٹ میں ذیلی حیثیت کے اور بھی چھوٹے چھوٹے قصے ہیں جن سے وابستہ کئی کردار ہیں جو گلی محلے کے اپنے طرز کے سماج سے نسبت رکھتے ہیں۔

ناولٹ کے اختتام پر زلیخا بائی کے حوالے سے چند کلیدی حیثیت کی باتیں ہمارے مہذب سماج کے نام نہاد شرفاء کے گوش گزار کی گئی ہیں۔

جیسے زلیخا چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو، ''تم ٹھٹھیری بازار سے کب تک دامن بچاؤ گے۔ ٹھٹھیری بازار تو تمہارے ارد گرد آباد ہے، تمہارے دلوں میں آباد ہے۔ بتاؤ..... بتاؤ۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'پستی کے مکیں' ص ۵۲)

دیکھا جائے تو 'انسدادِ عصمت فروشی قانون' ایک مستحسن قدم ہے۔ مگر غیر دیانتدار تو ہم ہیں کہ اس کے نفاذ میں رخنہ اندازی کرتے ہیں۔ بھلا اس راہ کی یہ ٹریجڈی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم یہاں بھی سوداگری کے درپے ہو جاتے ہیں۔ انھیں محض استعمال کی ایک شئے مانتے ہیں اور اپنی منافع خوری کا وسیلہ خیال کرتے ہیں۔

احمد یوسف کے دوسرے ناولٹ کا عنوان 'گناہِ آدم' ہے۔ یہ گناہ آدم اس ناولٹ کے چار مرکزی کردار ظہیر، ثریا، رفیق اور منیر میں سے دو کرداروں کے توسط سے سرزد ہوتا ہے اور پورے قصے کی بنیاد بن جاتا ہے۔ یہ دو کردار ظہیر اور اس کی معشوقہ ثریا کے ہیں۔ اس ناولٹ میں رؤسا اور نوابوں کی زوال آمادگی کی الم ناک روداد تحریر کی گئی ہے۔ ظہیر جو نصیر منزل سے متعلق تھا اور نواب نصیر کا چشم و چراغ تھا تو خود ثریا بھی بدرگنج کے رئیس میر وحید حسن کی اکلوتی دختر نیک اختر تھی۔ یہاں قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بلا نکاح اپنے ساتھ رکھنے کے باوجود عشق کی ماری ثریا کے ساتھ فوجداری کے وکیل وسیع حسن کے ذریعہ کی گئی محض ایک جبریہ بدسلوکی کے بعد ظہیر اُسے ایک رکشے پر بے یارو مددگار چھوڑ کر جہاں محبت کے تمام احساسات سے بے نیاز ہو جاتا ہے وہیں زندگی کے گزارے کے لئے وہ مدرسے میں نائب مدرس ہو جانے کے ساتھ اپنی بیوی زبیدہ کے اشتراک سے تھوک فروش بساطیوں کے لئے آرڈر پر کارڈ بورڈ کے ڈبے بنانے لگتا ہے۔ ایک نواب زادے کی اس نوع کی پستی کے احوال سے وابستہ ثریا کی تباہی کا عالم یہ ہے کہ ایک رئیس زادی ہونے کے باوجود وہ اپنے عاشق یعنی ظہیر کے ذریعہ ٹھکرائے جانے کے بعد ایک معمولی سے رکشہ والے رفیق کے رحم و کرم پر نہ صرف یہ کہ اس کے تعفن آلود معمولی سے کمرے میں چلی آتی ہے بلکہ اپنے حمل سے فراغت کے لئے ایک اسپتال کے خیراتی وارڈ میں داخل کی جاتی ہے جہاں سیزیرین آپریشن کے دوران وہ فوت ہو جاتی ہے اور اس کا بچہ رفیق کی تحویل میں چلا آتا ہے۔

اس ناولٹ میں رفیق رکشہ والے کا کردار نہایت اعلیٰ وارفع ہے۔ اس کے حوالے سے ناولٹ نگار نے گزرے ہوئے زمانے کی اخلاقی قدروں سے ہمیں متعارف کرایا ہے۔ دورِ حاضر کے بیشتر رکشہ والوں کا کردار یہ ہے کہ وہ پیشہ ور ہوں کہ راہ بھٹکی ہوئی خواتین، انھیں تباہی کی ڈگر پر لے جانے کا گھناؤنا کارنامہ وہی انجام دیتا ہے۔ مگر دورِ گزشتہ کے رکشہ والے رفیق کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ظہیر کی ٹھکرائی ہوئی ثریا کو پوری پاکیزگی کے ساتھ اپنی بہت محدود آمدنی کے باوجود اپنے یہاں نہ صرف یہ کہ پناہ دیتا ہے بلکہ

اس کے بطن سے تولد ہوئے بچے کی پرورش و پرداخت کا بوجھ بھی اپنے سر لیتا ہے۔

اب یہاں مرنے والی ثریا کی اس وصیت میں بڑا دم ہے کہ وہ بچہ رکھنے کا اختیار رفیق کو دے گئی تھی۔ اسے اس کے ایک طرز کے احتجاج سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ایک ذی وقار خاندان کے خطاوار کو اس کے بچے سے محروم کر دیا جائے۔ ہاں اسے بڑے ہوکر اپنے طور پر فیصلہ لینے کی چھوٹ دی گئی تھی۔ ثریا کا یہ احتجاج فطری بھی تھا کیونکہ اس نے ماقبل میں نواب نصیر اور میر وحید حسن دونوں کے یہاں اپنے سلسلے سے رفیق کو بھیجا تھا مگر دونوں ہی جگہ سے اسے جواب نفی میں ملا تھا۔

ہمارے معاشرہ میں کسی بھی بچے کی خاندانی نسبت اس کے باپ کے تعلق سے گردانی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک اعلیٰ خاندان والے کو کیونکر یہ گوارا ہوتا کہ ان کا بچہ ایک رکشے والے کے یہاں اپنے شب و روز بسر کرے۔

اس ضمن میں رکشہ والے رفیق اور ظہیر کے والد یعنی نصیر میاں کے اپنے اپنے واضح Stand تھے۔ رفیق کا تھپڑا اُٹھ کر رہ گیا، ''مرنے والی مرگئی لیکن اس سالے نے ایک دن بھی جھانکی نہیں ماری اور آج چلا ہے بچے پہ حق جتانے۔''

نصیر میاں تو جیسے سن کر بھبھک اُٹھے، ''یہ کیا بیہودگی ہے۔ ہمارا بچہ اور ایرے غیرے کے پاس پلے۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'گناہ آدم' ص ۷۰)

مذکورہ ناولٹ میں یہ بھی اہم ہے کہ اس کے خالق نے اپنے کردار ظہیر یعنی ظہرو کے ساتھ نکاح کے باضابطہ دو بول کے ساتھ نگینہ ساز تفضّل حسین کی اکلوتی بیٹی زبیدہ کی وابستگی کے تعلق سے ہمارے معاشرہ کے ذمہ داروں سے ایک بڑا ہی اہم سوال کیا ہے:

''کیا فرق آ گیا تھا۔ ثریا اور زبیدہ دونوں گھریلو لڑکیاں تھیں۔ فرد کے تصورات سماج کے تصورات سے کیوں ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'گناہ آدم' ص ۷۱)

ویسے زبیدہ کے دل میں ثریا کے بیٹے منیر کے لئے بڑی الفت تھی۔ گو کہ اس نے منیر کو دیکھا نہیں تھا پھر بھی عید اور بقرعید کے موقع پر اس کے لئے کپڑے تیار کر کے وہ بھیجتی ہے۔ ظہرو کو یہ پسند نہیں تھا۔

چنانچہ زبیدہ کے اصل جذبے کے سبب سے لاعلم رہ کر وہ یہ کہتا ہے:

''نیک بخت تو نے کبھی اپنی چادر دیکھی ہے۔''

''لیکن خشک زمین پانی کے لئے کس طرح فریاد کرتی ہے اس کا علم ظہرو کو نہیں تھا۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'گناہ آدم' ص ۷۴)

ثریا کا بیٹا رفیق کے ساتھ تھا اور اس نے اسے مولوی رشید کے مدرسے میں بٹھا دیا تھا۔ یہاں مسئلہ یہ تھا کہ رفیق اپنے روزگار کی خاطر نکل جاتا تھا اور منیر اپنے باوا کے لوٹنے تک کبھی فتح علی تو کبھی محبوب خاں کے یہاں رہا کرتا۔ محبوب خاں اور اس کی مدقوق بیوی کو صرف ایک بچی تھی اور کوئی بچہ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ منیر کو اپنے بچے کی طرح سمجھتے تھے۔

اسی طرح اردو کے کئی قاعدے ختم کر منیر پانچویں میں پڑھنے لگتا ہے۔ منیر کا گلی محلوں کے کھیلوں مثلاً گولی، لٹو اور تاش کے پتوں سے دل لگانا رفیق کو بالکل ناپسند تھا اور اس پر کسی قدر وہ سختی کرتا تھا۔ رفیق سوچتا:

''اب منیر ڈاکخانے اور کچہری کے سامنے چٹھیاں اور عرضیاں لکھنے کا کام تو کر ہی لے گا۔''

ادھر ظہرو خوش تھا:

''اب کوئی دن میں منیر اپنے بال و پر تولے گا اور اپنے آشیانے کی طرف لوٹ آئے گا۔''

مگر منیر نے رفیق اور ظہیر کے خیالات سے پرے ایک نئی راہ کا انتخاب کیا۔ وہ گیارہ سال کا ابھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن بیڑی سے شوق فرمانے کا حوالہ دے کر رفیق نے جم کر اس کی خبر لی۔ جس کے جواب میں منیر نے رفیق کی تحویل سے کچھ روپئے پیسے نکال کر وطن سے دور کلکتہ کا رُخ کیا۔ بڑا شہر تھا اور بڑے وسائل تھے جہاں وہ حبیبیہ ہوٹل کی ملازمت سے لگ گیا۔ اس کے بعد کلکتہ سے وطن اس کی آمد و رفت رہی۔ کلکتہ رہتے ہوئے رفیق، ظہیر اور زبیدہ کے خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ ساتھ ہی رفیق اور زبیدہ کے مشورے اور ان کی نصیحتیں شامل حال رہیں مگر اس نے کبھی ظہیر کے خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس دوران کلکتہ کے حالات بگڑ گئے اور وہاں لہو کا بیوپار ہونے لگا جس پر زبیدہ اور رفیق کے ایک ساتھ اسے خط موصول

ہوئے جس میں یہ اصرار تھا کہ کلکتہ کے حالات اچھے نہیں ہیں گھر چلے آؤ۔ منیر وطن لوٹ آیا۔ یہاں اس بار اس کے ملاحظے میں ایک نئی حقیقت یہ آئی کہ اس کے باوار رفیق نے بیاہ کر لیا تھا۔ مگر یہاں الفت کے تعلق سے جہاں وہ زبیدہ کی انتہائی محبت کا قائل ہو گیا وہیں رفیق کی بیوی کی سرگوشی میں اس کی آمد سے گرانی کے بول کی بنیاد پر اس کے دل میں کچوکے بھی لگے۔ چنانچہ اس نے اپنے باوار رفیق کے گھر سے نکل کر اپنے ابّا ظہیر کے گھر کی راہ لی جہاں زبیدہ اسے دیکھ کر نہال ہو گئی اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ ''بڑی نکل آئی ہے۔ اپنا گھر چھوڑ کر اتنی دور رہتے ہو؟'' ''منیر ہم لوگ کبھی یاد آتے تھے کلکتے میں''۔

ظہیر منیر سے ڈبے تیار کرنے میں معاونت کی توقع رکھتا تھا مگر زبیدہ نے اس سے محبت کے سوا کوئی توقع نہ کی تھی۔

انھیں دنوں منیر کے دل پر کاری ضرب یہ لگی کہ محبوب خاں کی بیٹی سے اس کی نسبت کے لئے بھیجا گیا رشتہ محبوب خاں کے بھائی حمید خاں کے ذریعہ اس بنیاد پر مسترد کر دیا گیا تھا کہ اس کے باپ تک کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔

ہمارے سماج میں شادی بیاہ کے سلسلے میں خاندان وغیرہ کی دریافت کا معاملہ ہر دور میں رائج رہا ہے اور جس کے سبب منیر کی طرح کسی بے قصور کو اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔

یہاں منیر بے حد افسردہ ہوتا ہے اور کلکتہ واپسی کا فیصلہ کر ڈالتا ہے۔

اس ناولٹ کا اختتامیہ بے حد اہم اور فطری حیثیت کا معلوم ہوتا ہے جو سید صاحب کے استفسار پر ظہرو کے کلمات کی صورت ادا ہوتا ہے:

''سید صاحب یہ خدائی خوار اپنی بے وفا ماں کی نشانی قرعہ نکالتا ہے کہ اس کا باپ کون تھا۔ کبھی آپ نے آج تک یہ باتیں سنی ہیں۔ کمبخت سمجھ لے کہ تینوں تیرے باپ ہیں۔''

اور منیر نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ابّا خدا کے لئے مجھے گالی نہ دو۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'گناہ آدم' ص ۹۰)

احمد یوسف کا یہ ناولٹ 'گناہِ آدم' ایک مربوط قصے کے ممکنہ تمام تر تقاضوں کی جہاں تکمیل کرتا دکھائی دیتا ہے وہیں جابجا ناولٹ نگار کے تحریر کردہ خوبصورت و معیاری جملوں کی آمیزش مثل کہکشاں ان کے نثری افق کو تابانی عطا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتی۔

احمد یوسف کے زیر نظر ناولٹ کی تیسری شمولیت کا عنوان ''جلتا ہوا جنگل'' ہے۔ اسی عنوان کا انھوں نے اپنے تین ناولٹ پہ مبنی مجموعہ کے نام کے اعتبار سے انتخاب بھی کیا ہے۔ یہاں بطور مجموعی ان کے ماقبل کے دو ناولٹ کی طرز کا کچھ دور تک باضابطہ کوئی رواں قصہ دکھائی نہیں دیتا بلکہ یہاں تو قدیم اور نئی عمارتوں، سڑکوں اور سماج کے مختلف اطوار کے بھلے ناموں کے ساتھ نوبیلے ناموں والے اہل شعور حضرات کے فکری اشتراک سے استفادہ کے پیش نظر ناولٹ نگار نے اپنے موضوع کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے بڑی امیدوں کا گویا ایک چراغ روشن کر رکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کاوش سے کوئی قابل قبول صورت برآمد نہیں ہوتی۔ جس پر ناولٹ کے ایک بڑے کردار رہبر کی خودکلامی گہری اہمیت کی حامل ہے:

''ایک معمولی سے کام میں بھی ہر فرد ایک الگ رائے رکھتا ہے۔ یا اللہ کیا ہوگا اس گھر کا۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'گناہ آدم' ص ۱۰۷)

اس ناولٹ میں سڑک کے ساتھ عمارتیں اپنے اپنے طرز کی علامتیں ہیں جن میں سڑک کی حیثیت راوی کی ہے۔ مثلاً یہ ایک ایسی سڑک ہے جس کا کمال یہ ہے کہ اس کا سفر بڑا طویل ہے اور اس کے جلو میں دو ایسی عمارتوں کے احوال پوشیدہ ہیں جن کے بڑے قصے ہیں۔ دھندلے پڑتے رنگ و روغن والی عمارت ہو یا رنگ و روغن سے لیس عمارت ہو، ان کے ظاہر و باطن سے گزرتے ہوئے سڑک کی زبانی ایک جانب جہاں زمانے کی ستم کاریاں ہم پر عیاں ہوتی ہیں وہیں ان کے مابین غیر اخلاقی رویوں سے ہونے والے بڑے نقصانات سے بھی ہم روبرو ہوتے ہیں۔

پہلی اُجڑی عمارت کا حال یہ ہے کہ وہ کسی حادثے کے سبب زندگی کے تمام آثار سے محروم ہو گئی ہے اور اب نہ وہاں مسکراہٹیں ہیں نہ قہقہے ہیں، نہ ہی وہاں ماتم کی اور آہ و فغاں کی آوازیں ہیں۔ یہاں ناولٹ نگار متنبہ کرتا ہے کہ عمارت کی اسکیفیت کے بڑے اسباب ہیں اور اس سے بے خبری نہیں وابستگی ضروری ہے۔ سڑک اس عمارت پہ ٹوٹی قیامت کی عینی شاہد ہے اور اس نے اس طوفان کے بھیانک نتائج دیکھے ہیں جہاں تلوار نے کیا کیا لہو کے گلستاں آباد کئے تھے۔ مگر وہیں اس دوسری عمارت کے حالات جدا ہیں۔ وہاں شوخی و سرمستی ہے اور خود میں مست و مگن رہنے کا اسے خمار ایسا ہے کہ وہ اس کی تباہی و بربادی سے یکسر غافل ہے۔ یہی نہیں وہ تو اس کے الم ناک حالات پر کہیں سے متفکر بھی نہیں ہے۔ یہاں خستہ حال

عمارت کو آزادی کے بعد کی اقلیت اور رنگ وروغن والی بڑی عمارت کو اکثریت کی علامت کے طور پر ہندو اور مسلم کے حوالے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

احمد یوسف نے یہاں نہایت علامتی انداز سے ہمیں یہ آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک بڑا کام ہے کہ اندر کی دنیا باہر کے متعلق جانے اور باہر کی دنیا اندر کی دنیا سے آگاہ ہو۔

یہاں سڑک پہ پھیلی اور بھی عمارتیں ہیں جن کے متعلق سڑک کا کہنا یہ ہے کہ سب کی مختلف کہانیاں ہیں جو موقع بموقع اپنے احوال بیان کرتی ہیں۔ حادثات سے بار بار گزرنے کے بعد جب بیان کرنے کو کچھ باقی نہیں رہتا تو وہ حقائق سے چشم پوشی کر ظاہری رونقوں اور روشنیوں سے معمور شادابی ونکھار کے عالم میں چلی آتی ہیں۔

مگر زمانے کی اس ظاہری چکا چوندھ سے ہمیں باہر نکال کر حالات کی ابتری سے باخبر کرنے کی غرض سے مذکورہ ناولٹ کے باب اوّل سے چل کر مزید چار ابواب تک کا سفر حالات کا بغور مشاہدہ کرنے اور درپیش مسائل کے سدباب کی تدابیر تلاش کرنے کی خاطر سماج کے کئی مکتب فکر کے کرداروں کو مع ان کے تعارف اور نجی قصوں کے ایک مقام پر لانے اور ہم آہنگ کرنے کی راہ میں سنجیدہ کردار رہبر کی کاوشیں لائق ستائش ہیں جسے عمارت کے مکیں رہبر قوم کے نام سے پکارتے تھے۔ یہاں اب یہ ٹریجڈی نہیں تو پھر کیا ہے کہ اسے اس کے کارِ خیر کے لئے یہ سزا ملتی ہے کہ دل کی خرابی والے منافق فتنہ گروں کے ذریعہ اسے پیروں سے معذور بنا کر بیسا کھیوں کا محتاج بنا دیا جاتا ہے کیونکہ وہاں ایک طبقہ ایسا تھا جس کا خیال یہ تھا کہ:

''یہ سب بکواس ہے، کھاؤ پیو اور مست ہو''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'جلتا ہوا جنگل' ص ۹۷)

اس ناولٹ میں پہلے باب کی راوی جہاں سڑک ہے وہیں بقیہ ابواب میں راوی کی حیثیت سے کہانی والے بابا کی جلوہ گری ہے۔ اس کے علاوہ ثبات اور سلیم کے کردار بھی یہاں اپنے کارناموں کے اعتبار سے گہری اہمیت کے حامل ہیں۔

باب دوم سے موسوم اس حصے میں ایک بڑا مختصر سا لیکن بڑی معنویت والا جملہ ناولٹ نگار نے تحریر کیا ہے کہ 'جاتے ہوئے کہتے تھے قیامت کو ملیں گے'۔ اس جملہ کی رو سے دیکھا جائے تو ایک بڑا ہی واضح اشارہ تقسیم وطن کے نتیجے میں پیدا شدہ ہولناکیوں کی نسبت سے ہماری فہم کا حصہ بنتا ہے۔ ظاہر ہے کہ

عمارتوں سے نکل کر دور دیس کو نکل جانے والے لوگ ہوں یا انسانیت کش فسادات میں ہوئی ہلاکتیں ہوں، عمارت کی خستہ حالی وویرانی کا براہِ راست سبب تو انھیں سے متعلق ہے۔

ان دنوں رہبر اپنے عزائم کے ساتھ جوان تھا:

''وہ کہتا ایسے طوفان تو کئی بار پہلے بھی آ چکے ہیں، لیکن اگر ایک بار یہ فیصلہ کر لو کہ جو کچھ طوفان اڑا لے گیا ہے، یعنی جو کچھ تم سے چھین لیا گیا ہے، اسے تم دوبارہ حاصل کر لوگے، تو یقین جانو خدا تمہاری مدد کرے گا، اور تم جلد یا بہ دیر دوبارہ ساری چیزیں حاصل کر لوگے۔ ہمت اور عزم راسخ اس راہ میں تمہاری معاونت کرے گا۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'جلتا ہوا جنگل' ص ۹۶)

رہبر ایک دفعہ سبھوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھنے کے عمل میں ملی چوٹ کے بعد بیسا کھیوں پہ چل کر ہسپتال سے جب واپس لوٹتا ہے تو ایک دفعہ پھر گھر گھر کی بہبودگی کے لئے منصوبہ تیار کرنے کی غرض سے ایک مرکزی کمیٹی کی تشکیل کی بابت غور کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے گرد منتشر الخیالی کا یہ عالم تھا کہ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ابھی تعمیر کا وقت نہیں آیا ہے اور وقت جب آئے گا تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جائے گا۔

رہبر کے رابطے کے ایک 'حال والے صاحب' جو جمال کے نام سے بھی جانے جاتے تھے اور ان کا حال یہ تھا کہ وہ بس حال کو جانتے تھے اور ماضی و مستقبل سے انجان تھے۔ زنجیروں والے صاحب جو وقار کے نام سے بھی جانے جاتے تھے، ان کے متعلق رہبر کا یہ خیال تھا کہ اب ان کے ذمہ ان کی جدا ہو گئی محبوبہ کے گلے میں زنجیر در زنجیر دھوئیں کے چھلے بنا بنا کر ڈالنے کے سوا اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ 'الجھے سلجھے خیالوں والے صاحب' اپنے نام سے عابد و مفکر کہلائے اور ان کی گرفت میں نہ صرف یہ کہ کل، آج اور کل پہ مبنی زمانے تھے بلکہ فکر کے ساتھ ان میں کچھ سوچ وسمجھ بھی تھی۔ اب اسے کیا کہیے کہ تینوں زمانے کے لئے وہ اپنے یکساں منطقی رویہ کے سبب الجھی سلجھی فکر کے کال میں گرفتار رہتے۔

'کتاب والے صاحب' جن کا نام ابوالخیر تھا کتابوں کے مطالعے میں گم رہا کرتے۔ جوانی میں ہر قسم کا لٹریچر پڑھا لیکن جب حیاتِ عزیز کے دن مختصر ہونے کو آئے تو محض ماضی کے ادبِ عالیہ، آج کے ادب، تاریخ الٰہیات اور سوانح عمریوں تک خود کو محدود کر لیا۔ مطالعے سے گہری وابستگی کے سبب گو کہ انھیں فرصت نہیں ملتی تھی پھر بھی لوگ انھیں صائب الرائے تسلیم کرتے تھے۔ 'تڑپتے ہوئے لہو والے

صاحب' کا نام شاکر تھا اور وہ ڈائرکٹ ایکشن والے آدمی تھے جس سے گھر کے لوگ خائف رہا کرتے۔ چنانچہ متذکرہ حضرات کی جدا جدا صفات کے باوجود جب ان کے حوالے سے گھر کی بقاء کی خاطر اس کی قلعی کرانے کی عملی سبیل دریافت نہ کی جا سکی تو ثبات نام کے نوجوان کو طلب کیا گیا جس نے محدود وسائل کے ساتھ مکان کی قلعی کا مسئلہ بہ آسانی حل کر دیا۔ مگر قسمت کی دیکھئے کہ برسات جو آئی تو تمام کاوشیں ڈھل کے رہ گئیں اور لوگوں نے ثبات کی تجویز کا مذاق اڑایا لیکن بیساکھی والے بابا نے مکان کی قدامت کے حوالے سے اس کی ٹپکتی ہوئی چھتوں کے ساتھ ٹوٹتے ہوئے فرش اور سیلن بھری دیواروں جیسے کئی عیب گنوا دیئے جس پر چہ میگوئیوں کے بعد لوگ سنجیدہ و متوجہ ہوئے لیکن خرچ کے لمبے چوڑے تخمینہ کے پیش نظر 'صرف اپنا' والا تصور بروئے کار لایا گیا اور راج مستری بلا کر کم خرچ پر اپنی اپنی چھتوں کی مرمت کرالی گئی۔

بیساکھی والے بابا لوگوں کی اس نوع کی خود غرضی پر متفکر ہو کر کہتے:

''آخر سبھوں کے متعلق لوگ کیوں نہیں سوچتے''

اِدھر کہانی والے بابا یہ کہتے دکھائی دیتے:

''شاید سبھوں کے متعلق سوچنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'جلتا ہوا جنگل' ص ۱۰۹)

بات محض یہیں تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ ایک دوسرا مسئلہ عمارت کے فی الوقت کے مکینوں کے سامنے یہ آن کھڑا ہوا کہ عمارت کی پورب جانب کی کوئی بیس فٹ لمبی دیوار آگے کی طرف جھک گئی اور ملحقہ دیوار کے فاصلے سے بے نقابی کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس چاک دامانی پر دیوار کی وقتاً فوقتاً رفو گری میں کی گئی کوتاہی کا خیال جہاں انھیں کچوکے دینے لگا وہیں نئی دیوار کے لئے خرچ کے سلسلے میں وہ غور و خوض بھی کرنے لگے۔

بہر حال بیساکھی والے بابا حالات کے پیش نظر سامنے آئے اور ان کی تجویز کے موافق پینٹنگ کے بڑے ماہر سلیم سے دیوار کے سائز کے کینوس پر ایک جنگل کی تصویر بنوانے کے لئے لوگوں نے آمادگی ظاہر کی، مگر افسوس کہ یہاں بھی خیر و شر کے تصادم کی کیفیت غالب آگئی۔ خیر کے حوالے سے بڑی اکثریت والے جنگل میں ہاتھی، بارہ سنگھے، ہرن، خرگوش، مور اور سارس کی شمولیت کے حق میں تھے اور ثبات کے خیالات سے اتفاق رکھتے تھے تو کچھ جسیم کے ہم خیال شر پسند تھے جو جنگل میں شیر، چیتے، تیندوے،

بھیڑیئے اور جنگلی سور کے ساتھ اژدہے کی موجودگی کے خواہاں تھے جو حیات انسانی کے لئے مضر خیال کئے جاتے ہیں۔ مگر ایک رہبر تھے جن کے پیش نظر محض اس بات کو ہی مرکزیت حاصل تھی کہ 'گھر کو بے پردگی سے بچانا ہے، پردہ جیسا بھی ہو'۔

بہر صورت جنگل کے سین سے آراستہ سلیم کے بنائے ہوئے پردے کے سلسلے میں یہ طئے ہوا کہ دیوار کے پیچھے پردے کے ٹانگے جانے کے بعد جھکی ہوئی دیوار توڑ دی جائے گی اور نئی دیوار کے لئے رقم فراہم کی جائے گی۔

لیکن انسانی منافقت کا عالم تو دیکھئے کہ ایک دن گئی رات کے سناٹے میں جنگل کی سین سے آراستہ وہ پردہ نذر آتش کر دیا گیا اور سطورِ بالا میں مرقوم فلاں فلاں صفات والی شخصیتوں نے اپنے حجروں سے باہر نکل کر چندھیائی آنکھوں سے جلتے ہوئے جنگل کو دیکھا کیا جنھیں اس آگ میں جنگل کے علاوہ اور بھی بہت کچھ جلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

سب بدحواس تھے اور ایسے عالم بدحواسی میں ناولٹ نگار نے اپنے فعال کرداروں میں رہبر یعنی بیساکھی والے بابا اور کہانی والے بابا کی زبانی ان کے گہری معنویت والے کلمات کے توسط سے ہم کو ہماری اصل صورتحال سے نہایت راست انداز میں آگاہ کرنے کا بڑا ہی اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

رہبر نے دھیمے لہجوں میں کہا:

''ہم نے تو ان دیواروں کے پیچھے اپنی عزت بچا رکھی تھی۔ اب تو خستگی، ندامت اور بوسیدگی سب کچھ سامنے آگئی''۔

جب کہانی والے بابا آئے تو ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی:

''پردہ ختم ہو گیا۔ اب ہمیں سارا زمانہ دیکھ رہا ہے''

''لیکن عزیز و شاید اب وقت آ گیا ہے''

(جلتا ہوا جنگل/ احمد یوسف، ناولٹ 'جلتا ہوا جنگل' ص ۱۱۱)

احمد یوسف کے مذکورہ ناولٹ کے باب پنجم کی شمولیت اس سبب سے ہے کہ اس کے توسط سے ان کے فنّی مراتب تک بہ یک نظر رسائی حاصل کی جا سکے۔

❁

جلتا ہوا جنگل (ناولٹ)

باب پنجم

تب ایک دن گھر کے ایک نوجوان نے بتایا کہ پورب جانب کی ایک بیس فٹ لمبی دیوار تو ایک عرصے سے سڑک کی جانب جھکی ہوئی تھی، لیکن ادھر اُس نے ایک دن یہ دیکھا کہ وہ تقریباً ایک ڈیڑھ انچ اور جھک گئی ہے، اور اب وہ اپنی ملحقہ دیوار سے اتنی دور ہوگئی ہے کہ اس کی درار سے مزے میں سڑک کا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ خبر ایسی صبا رفتار ثابت ہوئی کہ شام تک رہبر کے کمرے کے سامنے، سارا گھر امنڈ آیا۔

اس وقت رہبر یا بیساکھی والے صاحب ایک دم سے 'محترم' ہوگئے۔

''اب کیا ہوگا محترم؟''

''اگر ہم وقتاً فوقتاً رفو کرتے رہتے، تو شاید آج اس چاک دامانی کا المیہ سامنے نہ آتا۔''

''اب کسی واقف کار سے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ نئی دیوار کھڑی کرنے میں کتنا خرچ آئے گا؟'' پھر چند ثانیوں کے بعد بیساکھی والے صاحب نے ایک تجویز پیش کی۔

''میرے خیال میں فی الوقت ایک بڑی چادر دیوار کے پیچھے تان دی جائے تا کہ اگر خدانخواستہ یہ دیوار گر جائے تو پھر گھر کی بے پردگی نہ ہو۔''

اس پر ثبات نے کھڑے ہوکر بیساکھی والے صاحب سے کہا

''محترم بزرگ'' ہمارے درمیان اس وقت سلیم بیٹھے ہیں جو اسکرین پینٹنگ، وال پینٹنگ اور پیپر پینٹنگ کے بڑے ماہر ہیں۔ ہم کیوں نہ دیوار کے سائز کے کینوس پر ان سے جنگل کی سین بنوا لیں، یوں کہ ڈیپ شیڈ میں پردے کے پیچھے کا کوئی منظر سڑک والوں کو نظر نہیں آئے گا۔''

سلیم نے کہا ''میں یہ کام ہفتے دس دن میں کردوں گا، لیکن جنگل کی تصویر ہوگی تو اس میں جانور

بھی ہوں گے، آپ لوگ یہ بتائیں کہ اس میں کون کون سے جانور رکھے جائیں؟''

ثبات نے کہا۔'' جانور میں یہی ہاتھی، بارہ سنگھے، ہرن اور خرگوش وغیرہ ہوں، چڑیوں میں مور اور سارس وغیرہ۔''

ایکدم سے جسیم نے کھڑے ہوکر کہا۔'' یہ جنگل کا منظر ہے یا کسی چڑیا گھر کا۔''

''جنگل میں جب تک جنگل کا بادشاہ شیر نہ ہو، وہ جنگل جنگل کیا ہے، پھر اس کے ساتھ چیتے ہوں، تیندوئے ہوں، بھیڑیئے ہوں، جنگلی سور ہوں اور اژدہے ہوں، تب ہی کچھ بات بنتی ہے۔''

اس پر رہبر نے کہا۔'' گھر کو بے پردگی سے بچانا ہے، پردہ جیسا بھی ہو''۔

کچھ نوجوان کھڑے ہوکر بولے'' ہم لوگ ثبات کی تجویز سے اتفاق کرتے ہیں۔'' وہیں کچھ لوگ جسیم کے حق میں بھی بولنے لگے۔ عجیب افراتفری کا عالم ہوگیا۔

تب ہی رہبر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔'' آپ لوگ خاموش ہوجائیں۔''

جلسے میں کچھ سکون ہوا تو رہبر نے کہا۔'' میرے خیال میں اکثریت ہرن اور خرگوش والے جنگل کے ساتھ ہے۔''

بڑے زور کی تالیاں بجیں۔

تب طئے یہ ہوا کہ ہفتے دس دن میں جب سلیم پردے پر بنائے ہوئے جنگل کے سین کو دیوار کے پیچھے ٹانگ دے گا، تو دیوار توڑ دی جائے اور ایک نئی دیوار کی تعمیر کے لئے رقم فراہم کی جائے گی۔

کوئی پندرہ دن بعد جب پردہ لگ گیا اور دیوار ڈھادی گئی، تو سڑک کے لوگوں نے ایک بڑے خوبصورت سے جنگل کے مناظر کو اپنی آنکھوں میں بسا لیا۔ بارہ سنگھے، ہرن، ہاتھی، خرگوش، پھر پنچھی پکھیرو، سور، سارس اور مرغابیاں۔

ایک خوبصورلینڈ اسکیپ پر جنگل آباد تھا۔

اس موقع پر رہبر نے کہا۔'' دیکھو کینوس پر بنی ہوئی پینٹنگ گھر کا پردہ تو بن گئی، لیکن اب تم لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ نہ جاؤ۔ دیوار کے لئے پیسے کا انتظام شروع کردو۔

لوگوں نے رہبر کی ہدایت پر سنجیدگی سے عمل شروع کردیا۔

لیکن ایک دن جب گئی رات گھر کے اس علاقے کی طرف سے شور اُٹھا۔ جہاں جنگل کی سین

ٹانگی گئی تھی، تو لوگ دھڑا دھڑ اپنے کمروں سے نکلنے لگے۔ کینوس اور کینوس کی تصویر، سارا جنگل بری طرح آگ کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ پردے پر ربر ٹاٹ، تیل، وارنش اور رنگ کی ملی جلی بو سارے میں پھیلی ہوئی تھی اور دھوئیں کے مرغولے تیزی سے اوپر کی طرف جا رہے تھے۔

بیساکھی والے صاحب، زنجیروں والے صاحب، کتابوں والے صاحب، تڑپتے لہو والے صاحب، الجھے سلجھے خیالوں والے صاحب، سب اپنے اپنے حجروں سے باہر آنکلے تھے اور اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس جلتے ہوئے جنگل کو دیکھ رہے تھے۔ اس آگ میں انھیں جنگل کے علاوہ اور بھی بہت کچھ جلتا نظر آرہا تھا۔

رہبر نے کہا ’’اپنوں نے اپنوں کو نیچا دکھایا۔‘‘

زنجیروں والے صاحب نے کہا ’’میں تو دھوئیں کا ہالہ بناتا ہوں، مگر یہ تو آگ کا ہالہ ہے۔ آگ نے کب کسی کو بخشا ہے۔‘‘

سب بدحواس تھے۔

رہبر نے دھیمے لہجوں میں کہا۔ ’’ہم نے تو ان دیواروں کے پیچھے اپنی عزت بچا رکھی تھی۔ اب تو خستگی، ندامت اور بوسیدگی سب کچھ سامنے آگئی‘‘۔

کس نے کہا۔ ’’فائر بریگیڈ‘‘

’’ہاں فائر بریگیڈ۔ بازار والوں میں سے کسی نے خبر کر دی تھی، اب وہ آرہا ہے۔‘‘

اور جب کہانی والے بابا آئے تو ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

’’پردہ ختم ہو گیا۔ اب ہمیں سارا زمانہ دیکھ رہا ہے۔‘‘

’’لیکن عزیزو شاید اب وقت آگیا ہے۔‘‘

دیگر کتابیں

تعارف۔ ’بہار اردو لغت‘ :

بہار اردو لغت احمد یوسف کا بالکل دوسری نوعیت کا کام ہے کیونکہ احمد یوسف کی اصل شناخت فکشن نگار کی حیثیت سے ہے۔ پہلے ایک موضوع، پھر موضوع سے نسبت رکھنے والے جملے، پھر کردار نگاری، ماجرا نگاری اور منظر نگاری، تخلیقی ادب تحریر کرنے والے کے لئے بالکل ایک سلسلے کے عناصر ہیں مگر لغت کا میدان تو خالصتاً لفظیات پر مبنی ہونے کے سبب پورے طور پر تکنیکی عمل کے مترادف ہے۔ لغت نویسی آسان نہیں ہے کیونکہ یہاں الفاظ کی تلاش و دریافت میں گہری عرق ریزی کے ساتھ اس کے تمام ہونے تک ایک مدت صرف ہو جاتی ہے۔

احمد یوسف کی تیار کردہ بہار اردو لغت تقریباً تین ہزار الفاظ و محاورات پر مشتمل ہے۔ اس حوالے سے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ایک جامع اردو لغت کی تدوین کے سلسلے کے پہلے مرحلے میں محض بہار کے عطا کردہ الفاظ کی یکجا ترتیب کے خیال کو نہ صرف یہ کہ خاطر میں لایا بلکہ اسے بطور کتاب پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

الفاظ سے دل لگانا آسان نہیں ہے۔ یہ بڑے دل والوں کے بڑے بوتے کا کام ہے یعنی پوری دلجمعی اور بڑی مشقتیں یہاں درکار ہیں۔ احمد یوسف متذکرہ پیمانوں کے اعتبار سے اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں کے سہارے بحسن و خوبی اپنے مشن کے ساتھ منزلِ کامرانی کے پار اترے ہیں۔

بہار اردو لغت کی غرض و غایت کے تعلق سے انھوں نے بہار میں رائج کئی الفاظ کی ساخت سے نہ صرف یہ کہ ہمیں آگاہ کیا ہے بلکہ دیگر مقامات پر اس کے لفظیاتی چلن و اکابرین اہل کارنامہ کی وضع کردہ راہوں سے استفادہ کرنے کے عمل کی کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ یعنی اسم سے فعل بنانے پہ آیئے تو دتاتریہ کیفی کے طریقے کی رو سے برق سے برقانا اور قوم سے قومیانہ کی روش پر بہار میں ایک مدت سے پانی سے

پنپانا اور بات سے بتیانا کو قبولیت عام حاصل ہے۔ اسی طرح جمع کی ایسی ترکیب پہ آئیے کہ مذکر ومؤنث دونوں کے لئے یکساں طور پر وہ مستعمل ہو سکے تو اس عمل سے نسبت والی ایک بہت واضح مثال پیش کر احمد یوسف نے لڑکے/لڑکیاں کے لئے لڑکن کے استعمال کو بہاری کارنامہ قرار دیا ہے۔

احمد یوسف نے بہار کی بولی میں دوسرے علاقوں کی بہ نسبت انگریزی کے زیادہ عمل دخل سے اتفاق کرتے ہوئے ہمیں یہ باور کرایا ہے کہ یہاں سڑک کے مقام پر روڈ کو اور میز کو ٹیبل کی حیثیت سے بہ آسانی سمجھا جاتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی انھوں نے پیش کیا ہے کہ بعض الفاظ دہلی اور لکھنؤ میں 'ڑ' کے ساتھ لکھے اور بولے جاتے ہیں مگر بہار میں وہ 'ڑ' بن جاتے ہیں۔ جس کی ایک چھوٹی سی مثال مچھڑ ہے۔

لغت نویس نے یہاں بہاری الفاظ کے حوالے سے کئی توجہ طلب نکات سے ہمیں روبرو کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ ۲۶۴ صفحات پر مشتمل اصل لغت پہ آیئے تو نئے نویلے الفاظ ومحاورات کی برآمدگی کے سلسلے میں ان کی تحقیقی صلاحیت کا ذہن از حد قائل ہو جاتا ہے کہ عین اس کے بعد ان الفاظ کے معنی کی تلاش میں کس کس طرز کی حوالہ جاتی ڈگر سے ان کا گزر ہوا ہے، غور کیجیے تو سطح دل پر تحیر کی ایک کیفیت کا غلبہ سا دکھائی دے گا۔

مثلاً ایک لفظ انھوں نے 'آخ چھیں' لیا ہے اور اس کا معنی 'آخ تھو' تحریر کیا ہے۔ یہاں تک یہ ایک عام سا عمل ہے مگر یہاں کے بعد دشواری کے دریوں کھلتے ہیں کہ اس ضمن میں بطور حوالہ انھوں نے ایک شعر کا انتخاب کیا ہے جس کے مصرع ثانی میں ان کے متعلقہ لفظ کا اہتمام موجود ہے اور اس کے بعد سلسلے کی پوری تفصیل یعنی رسالہ 'اپنچ' ۱۹/اپریل ۱۹۰۶ء ص ۵ درج ہے۔ لفظ کی تلاش میں احمد یوسف افسانوں کا بھی رُخ کرتے ہیں۔ چنانچہ 'آ' کی ترتیب میں انھوں نے اپنے عزیز دوست کلام حیدری کے افسانوی مجموعہ 'صفر' کے افسانہ 'کس کی کہانی' سے 'آری' کے معنی پگڈنڈی کی برآمدگی کے بعد بسلسلۂ حوالہ ان کا ایک جملہ 'تمہارا ڈولا جاتے ہوئے کھیت، آری کو دیکھ رہا ہوں' تحریر کیا ہے۔ اسی طرح طنزیات کے مضامین سے اپنی دریافت کا نشانہ لئے جب وہ آگے بڑھتے ہیں تو مانپوری کے 'میونسپل الیکشن' تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں ان کا ایک محاورہ 'آنکھ کا پٹر کھلنا' ہمارے ملاحظے میں آتا ہے۔ اس ضمن میں متعلقہ جملہ یہ ہے ''اب جو وہاں پہنچ کر میونسپلٹی کی اندرونی دنیا کو دیکھتا ہوں تو آنکھوں کے پٹر کھل گئے۔'' اس کے نیچے بطور مجموعی احمد یوسف نے مانپوری۔ میونسپل الیکشن۔ طنزیات کے ساتھ صفحہ ۲۱۶ رقم کیا ہے۔

اس لغت میں 'آلو لوڑھنا' ایک ایسا محاورہ ہے جسے انھوں نے کلیم عاجز کی خودنوشت سوانح حیات 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی' سے برآمد کیا ہے۔ ان کے یہاں جس جملے میں اس محاورہ کی شمولیت ہے وہ کچھ یوں ہے، ''میلے کرتوں کی گودیوں میں لوڑھے ہوئے آلو لے کر درخت کے نیچے ایک کنارے پر لڑکے جمع ہوں گے۔'' یہ کلیم صاحب کی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۲۰۴ پر درج ہے۔

یہ چند مثالیں احمد یوسف کی بہار اردو لغت میں محض 'آ' کے تعلق سے تحریر کی گئیں۔ لفظیات کا یہ سفر ان کی سنجیدہ کاوشوں کے ساتھ 'ہ' کے حوالے سے 'ہنڈے کا گوشت' پہ تمام ہوتا ہے۔ گویا 'ی' اور 'ے' سے متعلق بات باقی رہ گئی۔

چنانچہ یہ کہنا بہر صورت درست ہے کہ لغت نویسی میں الفاظ کی آمد کے ہمہ دم امکانات باقی رہتے ہیں اور اس کے کسی ایک مرحلے میں مکمل ہو جانے یا ختم ہو جانے کی بات کہنا ایک طرز کے مبالغے کے مترادف ہے۔

احمد یوسف کی لغت کے تین صفحات کو یہاں اس خیال کے پیش نظر شمولیت دی جا رہی ہے کہ ان کی دید کے سہارے ان کے الفاظ ومحاورات کے معانی ومطالب کے ساتھ ان کی دریافت کے مختلف وسائل سے ہم آگاہ ہو سکیں۔

بہار اردو لغت کے تین صفحات

الف

آبھ = پرتَو۔

خود مادہ نہیں، مادوں سے پاک ہے، خدائی نور کا آبھ ہے۔

(بدرالحسن/ضمیمہ ٦، یادگار روزگار، ص ۱۳)

آپ تو آپ دیگر بغل چاپ = خود بھی آنا اور دوسرے کو بھی لانا۔

''آخر کار مشاعرہ میں بھی شریک ہوئے، اور آپ تو آپ دیگر بغل چاپ، ایک صاحب کو اور اپنا پشت پناہ سمجھ کر ہمراہ لے آئے۔

('اپنچ' ۱۹/اپریل ۱۸۹۴ء ص ۴)

آتاواتا=آتاجاتا

''آتاواتا خاک نہیں ہے،شہر میں رہتی ہیں،اچھے خاندان میں پلی ہیں۔''

(انٹرویو/اسرائیل کیفی/صنم ستمبر۱۹۵۹ءص۳۲)

آٹی=پیال کا چھوٹا گٹھر

''یا آٹیاں ایک ساتھ ملا کر باندھ دی گئی ہوں۔''

(بہار کے دیہاتی محاورے/شاہ مقبول احمد/صنم اگست ۱۹۵۸ءص۱۶)

آخ چھیں=آخ تھو

''کسی طرح انھیں آنے نہ دیں گے پاس مرے
وہ جب اٹھیں گے رقیبوں میں آخ چھیں ہوگی''

(الپنچ ۱۹/اپریل ۱۹۰۶ءص۵)

آدرمان=قدرومنزلت

''نئی نئی دلہن بھابھی جواتنی بڑی ہونے کے باوجود بہت آدرمان سے اس کی ساتھی ہوگئی تھیں۔''

(ح۔م۔اسلم/دولن بھابھی/بہار کے نو چراغ ص۱۶۴)

آدمی دو پیسے کی ہانڈی بھی لیتا ہے تو ٹھوک بجا کر=دیکھ بھال کر کام کرنا چاہئے۔

''یعنی بیویوں کی جتنی قسمیں ہوسکتی ہیں،ان میں سے کون سی قسم کی بیوی ہوسکتی ہیں،کچھ خبر نہیں،مثل ہے کہ آدمی دو پیسے کی ہانڈی بھی لیتا ہے تو ٹھوک بجا کر۔''

(مانپوری/اڈیشنل وائف/طنزیات ص۱۹۰)

آدمی کا نصیب پتہ کے نیچے=کس وقت قسمت کے دروازے کھل جائیں۔

''خدا جسے اقبال دیتا ہے،صفاتِ حمیدہ اس میں خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں۔آدمی کا نصیب پتہ کے نیچے ہے،موقع آجانا شرط ہے۔''

(بدرالحسن/یادگار روزگار ص۱۵۳)

آدھوآدھ=آدھے آدھ۔

''اے صاحبزادی کیونکر جانے دوں نگوڑا آدھوآدھ روٹی چھین لی کیا مرنے جوگے کے باپ کا مال تھا۔''

(حلیۃ الکمال/شاد عظیم آبادی ص۳۲۹)

آرنہیں تو پار=یا اِدھر یا اُدھر۔

''اس نے تو اپنی آفت رسیدہ بیوی کے بارے میں طئے کرلیا تھا کہ آج کی رات آرنہیں تو پار۔''

(ناول کا جنم/ش مظفر پوری/صنم دسمبر۱۹۵۱ءص۳۰)

آرہ گز=تیلیاں

''جس طرح کسی پہیے کے تمام آرہ گز اوس کی ناہ کے پاس مجتمع ہوتے ہیں۔''

(انسان کی پرواز/عزیزالدین بلخی ص۲۳۷)

آری=پگڈنڈی

''تمہارا ڈولا جاتے ہوئے کھیت،آری کو دیکھ رہا ہوں۔''

(کلام حیدری،کس کی کہانی 'صفر' ص۱۵۹)

آری پگاری=(دو کھیتوں کے درمیان جو مینڈ ہوتی ہے،اسے گاؤں میں آری پگاری کہتے ہیں)۔

''ہے بالیدہ آری پگاری پہ گھاس
سڑک کے کنارے درختوں کے پاس''

(جلوۂ صدرنگ/عبدالمجید شمس ص۶۱)

آسامی=جیل کی اصطلاح۔

''قیدیوں کو جیل کی زبان میں آسامی کہتے ہیں۔''

(غلام سرور/گوشے میں قفس کے ص۱۹)

آسمان پر لات مارنا=حقارت سے دیکھنا

''سنو ذرا اس کی بات اگر پوچھتا تو آسمان پر لات مارتی۔''

(سرتاج/شہناز شعیبی/صنم اگست۱۹۵۸ءص۳۷)

آسمان تارہ=ایک آتش بازی۔

''آسمان تارہ ستارہ منڈل ہوائیاں اقسام کی چھوڑی جاتیں۔''

(میری کہانی میری زبانی/ ہمایوں مرزا ص ۸۳)

آغا تقی کے باغ میں کوّا حلال ہے = محیر العقول واقعے کا ظہور۔

''اے پنچ پی لو کہ کہتے ہیں آج سب
آغا تقی کے باغ میں کوّا حلال ہے''۔

(الپنچ/ وہی یاروں کا یار، ۱۴؍ جنوری ۱۸۹۸ء ص ۶)

آ کر کے = آ کر

''اذان کی آواز سنتے ہی راجہ کے آدمی آ کر کے ہم لوگوں کو مار ڈالیں گے۔''

(مولوی عبدالرحیم/ تذکرۂ صادقہ ص ۱۳)

آل = کھیت میں مٹی ڈال کر اس کی حد بندی کرنا۔

(الف) ''ایک نہر اس طور پر جاری کرنی چاہئے کہ تھوڑی سی آل توڑنے سے پانی کیاری میں داخل ہو جاوے۔''

(اخبار بہار/ ۱۱؍ دسمبر ۱۸۵۸ء ص ۶)

(ب) ''کسی کھیت کے گرد آل نہ تھی، جہاں پانی تھا وہاں سے اوس کو نکال پھینکنے کی ترکیب کسی کو معلوم نہ تھی۔''

(تحریک/ احسن علی ص ۱۵۳)

آلو لوڑھنا = جڑوں سے آلو نکالنا۔

''مَیلے کُرتوں کی گودیوں میں لوڑھے ہوئے آلو لے کر درخت کے نیچے ایک کنارے پر لڑکے جمع ہوں گے۔''

(کلیم عاجز/ جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی ص ۳۰۴)

آلے = ہرے

''وہ چھریاں کھائی ہیں دل نے کہ اب تک زخم آلے ہیں۔''

(شاد عظیم آبادی/ نقشِ پائیدار ص ۹)

آنب = انبہ

''آنب چھو لیتے ہیں سبزے کی پھننگ۔''

(شاد عظیم آبادی/ صورت الخیال ص ۷)

آنٹھی = تاڑ کا پھل۔

''نہ پرم ہے اور نہ آنٹھی ہے۔ میں ہوں اور افسروں کی لاٹھی ہے''

(عمر دراز/ مضامین گیلانی ص ۳۹)

آنسو کا جھر جھرانا = آنسوؤں کا تیزی سے بہنا۔

''جوزف کی آنکھوں میں آنسو ایک ہی دفعہ جھر جھرا کر بہ نکلے۔''

(شکیلہ اختر/ منزل 'تنکے کا سہارا' ص ۱۴۶)

آنکھ ہے یا آلو = بے مصرف آنکھیں

''کسی کو کم دکھائی دیتی ہے تو یہ نہیں کہتے کہ آنکھ ہے یا بھنڈی کہتے ہیں کہ آنکھ ہے یا آلو۔''

(بات میں بات/ ارشد کاکوی/ صنم جولائی ۶۱ء ص ۲۷)

آنکھ کا پٹ کھلنا = کسی راز سے پردہ اٹھ جانا۔

''اب جو وہاں پہنچ کر میونسپلٹی کی اندرونی دنیا کو دیکھتا ہوں تو آنکھوں کے پٹ کھُل گئے۔''

(مانپوری/ میونسپل الیکشن/ طنزیات ص ۲۱۶)

آنکھوں کا لب لبا اٹھنا = آنکھوں کا بھر آنا۔

''اُس کی جھیل جیسی آنکھیں لب لبا اٹھیں اور ٹمپریچر چارٹ پر اس کے قلم کی نوک ٹوٹ گئی۔''

(خون/ طارق/ صنم جولائی ۶۱ء ص ۳۰)

آنکھ کان میں ایک لڑکا = اکلوتی اولاد۔

''ابھی میرا دل اتنا سخت نہیں ہوا ہے کہ آنکھ کان میں ایک لڑکے کو کالے کوسوں بھیجوں۔''

(ایک چراغ اور بجھا/ شہناز شعیبی/ صنم اپریل ۵۸ء ص ۱۸)

❋

تعارف ۔ 'وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں' :

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے تعلق سے احمد یوسف کے ذریعہ کئے گئے کاموں میں ان کا ایک ترجمے کا کام بھی شامل ہے۔'وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں' دراصل مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر سچدا نندسنہا کی انگریزی میں شائع شدہ ایک اہم دلچسپ معلوماتی کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ انھوں نے کیا ہے۔ایک عام خیال ہے کہ کسی بھی زبان کی کتاب کے اچھے ترجمے کا کمال یہ ہونا چاہئے کہ ترجمہ ہی اصلاً اس کی شناخت بن جائے۔اٹھارہ صفحات پر مشتمل احمد یوسف کا یہ ترجمہ نہ صرف یہ کہ دوران مطالعہ بہترین روانی کا مظہر ہے بلکہ اپنے برمحل الفاظ کے استعمال کے اعتبار سے سطورِ بالا میں درج اچھے ترجمے کی صفات کے عین موافق بھی ہے۔ جناح کے سلسلے میں ڈاکٹر سچدا نند سنہا نے لندن سے اپنی رفاقت کا ذکر کیا ہے جہاں پیشۂ وکالت میں موہن داس کرم چند گاندھی اور سرعلی امام وغیرہ بھی نامزد کئے گئے تھے۔

ڈاکٹر سچدا نند سنہا نے اپنے اس خاکے کے توسط سے مسٹر جناح کے سلسلے میں ایک کھلی حقیقت سے روبرو کراتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے کہ اپنے ہم مذہبوں کے لئے ہندستان کے نقشے سے انھوں نے ایک آزاد خودمختار ملک نکالنے میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔

ہندستان کی سیاسی بساط پر کانگریس اور مسلم لیگ کے حوالے سے جناح کی سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ان کی شادی، ان کی وضع قطع اور برتری کی خاطران کی بیدار روش جیسے دیگر دلچسپ واطلاعاتی قصے یہاں بہ شوق پڑھے جانے کے قابل ہیں۔اس ضمن میں سابق وزیر حکومت بمبئی سر رفیع الدین احمد کے ذریعہ ۱۹۱۰ء میں کلکتہ میں منعقدامپیریل لیجسلیٹیو کانگریس کے پہلے سیشن میں مسٹر جناح سے اردو فارسی اور عربی زبانوں کے جاننے اور ان سے عبادت سے متعلق کئے گئے سوالات اور جناح کے بے خوف وباجواز جوابات کو بطورِ خاص دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔نمونۂ فن سے وابستگی کے پیش نظر کتابچہ کے دو ۲ صفحات کی یہاں شمولیت ہے۔

وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں کے دوصفحات

اس وقت جناح زبردست عقلیت پسند تھے اسی طرح گوکھلے کو سخت قسم کا لاادری شمار کیا جاتا تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۴۱ء کو ۲۔گنیش کھنڈ روڈ، پونا سے سر رفیع الدین احمد سابق وزیر حکومت بمبئی نے جو خوش قسمتی سے

ابھی ہمارے درمیان ہیں ایک خط میں مجھے یہ تحریر کیا کہ" کیا آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ کو کلکتہ کی وہ نشست یاد ہے جو ۱۹۱۰ء میں امپیریل لیجسلیٹیو کانگریس کے پہلے سیشن میں اس کی عمارت کے ایک کمرے میں ہوئی تھی اور کیا آپ کو اب بھی میرے وہ سوال یاد ہیں جو میں نے اس موقع پر جناح سے ان کے مذہب کے متعلق کئے تھے۔میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت آنجہانی مہاراجہ آف بردوان بھی کمرے میں موجود تھے۔پچھلی بار جب ہم بمبئی میں ملے تھے تو آپ نے مجھے اس واقعہ کی یاد دلائی تھی اور ہم لوگ اس پر دل کھول کر ہنسے تھے۔"میں نے سر رفیع الدین کو جواب دیا کہ مجھے اچھی طرح وہ موقع اور وہ مخصوص واقعہ یاد ہے۔ جہاں تک اس گفتگو کا سوال ہے جس کا حوالہ انھوں نے دیا تھا، اسی کے سلسلے میں یہ وضاحت کرتا ہوں کہ سابق وزیر رفیع الدین جناح کے شکست خوردہ حریف تھے اور انھوں نے پونا سے کلکتہ کا طول طویل سفر اختیار کیا تھا۔ بین طور پر اس غرض سے کہ یہ بات ثابت کر دکھائی جائے کہ جناح (گرچہ محض اتفاقیہ منتخب ہوگئے تھے) اس کے اہل نہیں ہیں کہ بمبئی پریسیڈنسی (بشمول سندھ) کے مسلمانوں کے واحد نمائندے کی حیثیت سے امپیریل لیجسلیٹیو کانسل میں شریک ہوں۔وہ گفتگو جو رفیع الدین اور جناح کے درمیان ہوئی اسے میں ذیل میں اپنی ڈائری سے نقل کرتا ہوں۔

رفیع الدین ---مسٹر جناح، آپ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ بمبئی پریسیڈنسی کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں؟

جناح ---کون اس پر شک کرتا ہے؟ آپ کرتے ہیں؟

رفیع الدین --- مجھے افسوس ہے کہ آپ جیسے لوگ ان کی نمائندگی کریں گے جو اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے ہیں اور نہ اسلامی احکام کی پیروی کرتے ہیں۔

جناح --یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ سے کہیں زیادہ۔

رفیع الدین --آپ کے کہنے کے مطابق آپ جانتے ہیں، تو یہ بتائیں کہ آپ دعویٰ کرتے ہیں آپ عربی یا فارسی جانتے ہیں؟

جناح --مجھے کیا ضرورت ہے عربی یا فارسی جاننے کی؟ میں نہ تو عرب ہوں اور نہ ایرانی، میں تو ہندوستانی ہوں اور یوں مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں عربی یا فارسی جانوں۔

رفیع الدین --لیکن کیا آپ اردو جانتے ہیں؟

جناح --اس حد تک میں ضرورت جانتا ہوں کہ میں اپنے چھوکروں اور حمالوں سے بات کرسکوں۔ مجھے اردو میں عدالتوں اور ارکان جیوری سے بات نہیں کرنی ہوتی ہے اور میں نہیں سمجھتا ہوں کہ مجھے زیادہ زبان جاننے کی چنداں ضرورت ہے، ویسے میں گجراتی اچھی طرح جانتا ہوں۔

رفیع الدین -- لیکن اگر آپ عربی نہیں جانتے ہیں تو آپ عبادتیں کس طرح کرسکتے ہیں؟

جناح --عربی میں عبادت میں کیوں کروں؟ میں کوئی ایسا زبردست گناہ گار تو نہیں ہوں کہ اپنے گناہوں کی معافی کے لئے برابر عبادت کرتا رہوں۔ قطع نظر اس سے یقینی طور پر میں جس زبان میں بھی اپنی التجا کروں گا خدا اُسے سمجھ لے گا۔

رفیع الدین --- اور آپ اپنے ملبوسات، کھانے پینے اور مشروبات کے سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا یہ سب شریعت کے مطابق ہیں؟

جناح ---لباس کا شریعت سے کیا تعلق؟ یقینی طور پر مختلف مسلم ممالک کے لوگوں کا پہناوا مختلف ہے، حتیٰ کہ ہندوستان میں بھی سبھی مسلمان ایک طرح کا لباس نہیں استعمال کرتے۔ جہاں تک کھانے پینے کا معاملہ ہے اس کا تعلق بیشتر ذاتی پسند و ناپسند، اشتہا اور ہاضمے سے ہے نہ کہ مذہبی رسم و رواج سے۔

تعارف ۔ مبارک عظیم آبادی :

احمد یوسف کی دیگر کتابوں کے سلسلے کی ایک کتاب 'مبارک عظیم آبادی' ہے جسے انھوں نے ترتیب دیا ہے۔ متذکرہ کتاب ۲۰۰۶ء میں بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ ۴۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب عظیم آباد کے ایک مشہور و معروف شاعر مبارک عظیم آبادی کی شخصیت اور فن سے متعلق سیر حاصل اطلاعات کے اعتبار سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

مبارک عظیم آبادی اردو شاعری میں داغ کے شاگرد تھے تو فارسی میں انھوں نے حکیم عبدالحمید پریشاں سے اصلاح لی تھی۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'جلوۂ داغ' ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔ حیات مبارک ان کا فارسی کلام (قلمی نسخہ) ہے۔ 'جلوۂ داغ' کے سلسلے کی دلچسپ اطلاع یہ ہے کہ مبارک عظیم آبادی نے اس کا انتساب ڈاکٹر سید محمود کے نام کیا ہے جو بہار کے وزیر تھے۔ اس کتاب کی پہلی تقریظ خان بہادر رضا علی

وحشت تو دوسری تقریظ جانشینِ داغ نوح ناروی کی تحریر کردہ ہے۔ اس کے علاوہ یہاں یہ بھی اہم ہے کہ اس کا مقدمہ مولوی فصیح الدین بلخی کے حوالے سے ہے۔ ادھر کلیات مبارک عظیم آبادی کا قصہ یہ ہے کہ یہ عظیم آباد کے نام انتساب کی گئی ہے۔ احمد یوسف نے اپنی اس کتاب کے آخری حصے میں جہاں ان کی غزلوں کے کئی نمونے فراہم کرائے ہیں وہیں دونوں کتابوں کے مشمولات کو بہ اعتبارِ حروفِ تہجی مع ان کی تعداد کے ہمارے گوش گزار کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ مبارک، ڈاکٹر مبارک یوں ہوئے کہ انھوں نے طب یونانی اور ہومیو پیتھی کی طرف توجہ کی۔ مبارک عظیم آبادی کی پیدائش ۲۱/اپریل ۱۸۶۹ء میں دربھنگہ میں ہوئی تھی۔ عظیم آباد میں وہ پہلے آغا حسین کے چوراہے کے ایک مکان میں رہے اور بعدہٗ محلّہ چوک شکار پور میں منتقل ہو گئے تھے۔ ان کا سن وفات ۱۹۵۸ء ہے۔

مبارک عظیم آبادی کے والد فدا حسین وامق انگریزوں کے عہد میں منصف ہوئے۔ اس کتاب سے وابستگی کے خیال کے پیش نظر اس کے تین صفحات کو یہاں شمولیت دی گئی ہے۔

مبارک عظیم آبادی کے تین صفحات

یہ داغ سخن سنج کا ہے فیض مبارک

مبارک عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام 'جلوۂ داغ' ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے ۱۹۳۵ء میں قلمی نسخے کی صورت میں 'مرقع سخن' ہمارے سامنے آچکا تھا۔

سوانح مبارک سے متعلق مواد ہمیں درج ذیل کتابوں سے ملتا ہے۔

۱۔ مقدمہ 'جلوۂ داغ' از فصیح الدین بلخی ۱۹۵۱ء

۲۔ 'یاران میکدہ' مرتبہ محمود علی خاں صبا عظیم آبادی (نوشتہ مبارک)

۳۔ 'مسلم شعرائے بہار' ---سید احمد اللہ ندوی۔

'مسلم شعرائے بہار' میں مبارک عظیم آبادی کے دو خطوط بھی ملتے ہیں۔ پہلا خط ۲/فروری ۱۹۳۵ء کا ہے اور دوسرا خط ۲۶/جون ۱۹۳۵ء کا ہے۔

اس وقت وہ آغا حسین کے چوراہے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ اس کے بعد وہ محلّہ چوک شکار پور میں منتقل ہو گئے، جیسا کہ انھوں نے ایک خط بنام فصیح الدین بلخی بتاریخ ۱۹/دسمبر ۱۹۴۵ء میں تحریر کیا تھا۔

۱۹۳۸ء میں ایک اہم قلمی نسخہ 'حیات مبارک عظیم آبادی' وجود میں آیا جسے ابوالخیر رحمانی نے تحریر کیا تھا۔

انگریزوں کے عہد میں مبارک صاحب کے والد منصف ہوئے۔ وہ بابا فرید گنج شکر کی اولاد میں تھے۔ ان کی پیدائش ۲۱/اپریل ۱۸۶۹ء میں دربھنگہ میں ہوئی تھی۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔

ابوالخیر رحمانی نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ 'جلوۂ داغ' کی وہ غزل جس کا مقطع درج ذیل ہے۔ مبارکؔ عظیم آبادی نے شاہ حامد حسین صاحب کے یہاں کے مشاعرے میں سنائی تھی۔

دم رخصت مبارکؔ یوں تہہ دل سے دعا گو ہے
سخن سنجو، خدا حافظ گلستان معانی کا

اس مقطع نے مشاعرے کا رنگ بدل دیا، سامعین کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور وہ دیر تک 'آہ آہ' کرتے رہے۔

مبارک عظیم آبادی کو حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین قدس سرہٗ سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ کے دست مبارک پر قادریہ سلسلے میں بیعت کا شرف حاصل تھا۔ ان کا طریقہ صلح کل تھا، کسی غیر مذہب والے سے نہ تعرض اور نہ تعصب۔ ملاحظہ ہو مبارک کا یہ شعر ۔

محبت کے پجاری تو کسی سے نہیں بنا رکھتے
مساوی میں مراسم ان کے ہر شیخ و برہمن سے

جب معاش کی فکر ہوئی تو طب کی طرف متوجہ ہوئے۔ فارسی کی دو کتابیں طب سے متعلق دستیاب ہوئیں۔ 'میزان الطب' اور 'طب الکبیر' لیکن جلد ہی طبیعت اچاٹ ہوگئی، اور تب چھ سال تک ہومیوپیتھی کی تعلیم حاصل کی اور مطب کھولا۔

مولف 'مسلم شعرائے بہار' کو لکھتے ہیں:

''جناب شمس العلماء امداد امام اثر مرحوم، سر علی امام کے باپ ہمارے ممیرے سسر تھے۔''

مبارکؔ عظیم آبادی کے والد فدا حسین وامقؔ مولوی سید حسن حسرت کے شاگرد تھے۔

غزل

پاؤں نکلا کبھی وحشت میں نہ باہر اپنا / میں وہ دیوانہ ہوں جنگل ہے جسے گھر اپنا
کیا غرض اس کو نکالے جو وہ خنجر اپنا / خود گلا کاٹ لے دوبھر ہو جسے سر اپنا
تجھ میں وہ بات کہاں گھات کہاں اے ظالم / تجھ کو اے چرخ کہیں خاک ستمگر اپنا
میری سنتے نہیں وہ کوئی بتا دے مجھ کو / حالِ دل لوگ کہا کرتے ہیں کیوں کر اپنا
چھیڑ یوں جلوہ فروشوں سے چلی جاتی ہے / بیچتا ہو جو کوئی لے دل مضطر اپنا
جب نگہ اس نگہ مست سے لڑ جاتی ہے / مئے گل رنگ سے بھر دیتی ہے ساغر اپنا
وہ نگہ دل پہ لگا دیتی ہے برچھی اپنی / وہ مژہ دل میں چبھو دیتی ہے نشتر اپنا
ہم بھی جیتے تھے کبھی زندہ دلوں میں تھا شمار / اب یہ جینا تو ہے مرنے کے برابر اپنا
دھاک اقلیم سخن میں ہے مبارکؔ اپنی / یعنی استاد ہے وہ داغ سخنور اپنا

غزل

آخری دور کا کچھ اور قرینا ہوگا / جام ہوگا کہیں خالی کہیں مینا ہوگا
مجھ کو معلوم ہے انجام محبت کیا ہے / ایک دن موت کی امید پہ جینا ہوگا
کب وہ آئیں گے الٰہی مرے مہماں ہوکر / کون دن کون برس کون مہینہ ہوگا
قیدِ ہستی سے وہاں بھی نہ رہائی ہوگی / بعد مرنے کے بھی سنتے ہیں کہ جینا ہوگا
تو تو زاہد مجھے کہتا ہے کہ توبہ کر لے / کیا کروں گا جو کہے گا کوئی کہ پینا ہوگا
پھر بہار آئی مبارکؔ گئی گزری توبہ / پھر وہی دست و بغل، ساغر و مینا ہوگا

اجمالی جائزہ

احمد یوسف عظیم آباد کی ایک چلتی پھرتی تہذیب کی علامت تھے۔ گرچہ ان کا تعلق ایک زمیندار اور تاجر گھرانے سے تھا پھر بھی ادبی سلسلے سے یہاں اہم یہ ہے کہ خود ان کے والد کی حیثیت شاعر وادیب کی تھی جس کے سبب انھیں اپنے ہی گھر سے ادبی ماحول میسر آیا۔

احمد یوسف اردو کے معتبر ومحترم افسانہ نگاروں کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء سے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا افسانہ 'پکا ارادہ' ہے جو نئی راہ گیا میں شائع ہوا تھا۔ ان کے معاصر افسانہ نگاروں میں غیاث احمد گدی، کلام حیدری، انور عظیم، اقبال متین اور جوگندر پال وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

ادبی دنیا میں فکشن کے حوالے سے بطور فکشن نگار ان کی بنیادی حیثیت قرار پائی مگر اس سے آگے بھی چونکہ مختلف طرز کے ان کے کارنامے ہمارے ملاحظے میں آئے سو اس لحاظ سے ان کا قد اوروں سے کچھ بلند ہو جاتا ہے۔ انھوں نے رپورتاژ تحریر کی۔ خاکے تحریر کئے، ادب کو تین ناولٹ کا مجموعہ 'جلتا ہوا جنگل' عطا کیا۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے پروجکٹوں کے حوالے سے 'بہار اردو لغت' کی پیشکش کے علاوہ ڈاکٹر سچد انند سنہا کی انگریزی کتاب کا بعنوان 'وہ جناح جنہیں میں جانتا ہوں' اردو ترجمہ کیا اور بہار اردو اکادمی پٹنہ کی جناب سے ان کی ترتیب دی ہوئی ایک کتاب 'مبارک عظیم آبادی' منظر عام پر آئی۔

خیر! بات پہلے افسانوں کی کرتے ہیں۔ احمد یوسف کے چار افسانوی مجموعے بنام 'روشنائی کی کشتیاں'، 'آگ کے ہم سائے'، '۲۳ گھنٹے کا شہر' اور 'رزم ہو یا بزم ہو' اشاعت پذیر ہوئے۔ اس کے علاوہ ملک وبیرون ملک کے مؤقر رسائل وجرائد میں بھی نصف صدی سے زائد کے عرصہ تک ان کے افسانے مقام پاتے رہے۔

ان کے افسانوں کے موضوعات کا جہاں تک سوال ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں

متذکرہ سمت میں فکری اعتبار سے بڑا تنوع ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا ایک گہرا مشاہدہ ہے جس کے نتیجے میں زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہماری آگاہی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں عمومی موضوعات کے علاوہ کئی ایسے افسانے دستیاب ہیں جو اردگرد کی دنیا اور کوچہ وبازار کے قصوں سے متعلق تحریر کئے گئے ہیں۔ یعنی مقامی زندگی اور اس سے وابستہ پرانے شہروں کے گلی کوچوں کی تہذیب کے احوال احمد یوسف کے فن کا اہم حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ افسانہ 'بیس کاریگر' اور 'عبدالرحیم ٹی اسٹال' کے علاوہ ان کے اور بھی افسانے ہیں جنہیں اس سمت کے راست ترجمان کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ دراصل ماضی کی تہذیب سے ان کی جذباتی وابستگی ہے اور اس کے مٹ جانے کا دکھ ان کے دل پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔

افسانہ 'چراغ کشتہ' ڈائرکٹ Narration میں تحریر کیا گیا ہے کہ اچھے گھروں کے اپنے آقاؤں سے وابستہ ملازم بھی تہذیب یافتہ اور شائستہ مزاج بن جاتے ہیں۔ وہ دستِ سوال دراز کرنے یا بھیک مانگنے کے عمل میں بھی بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ لمبی چوڑی تمہید کا سہارا لیتے ہیں۔ افسانہ 'نقش ناتمام' میں سماج کے بالکل غریب طبقے کے حالات رقم کئے گئے ہیں جہاں سڑک کنارے کے بالکل عام سے کردار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ افسانہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ اپنے مرکزی کردار قاسم رکشے والے کے حوالے سے اسی شہر عظیم آباد سے تعلق رکھتا ہے۔

احمد یوسف کے یہاں دو[2] موضوعات کا بطورِ خاص اظہار نظر آتا ہے جن میں شمار اوّل تو یہ ہے کہ تقسیم وطن کے نتیجے میں ایک بے حد ہنستی بولتی ہوئی بزم کے ٹوٹ جانے کے کرب سے وہ دوچار دکھائی دیتے ہیں۔ تقسیم وطن کے سبب خاندانوں کی تقسیم کے المیے پر 'تلوار کا موسم'، 'وقت رخصت' اور 'قربت کی دوری' وغیرہ ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔

اسی طرح ان کے یہاں خصوصی توجہ کے حامل موضوعِ دوم کے اظہار کی صورت ان کے نہایت مشہور افسانہ 'حسن پور سے' کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی کے سیاق وسباق میں متذکرہ افسانہ تحریر کیا گیا ہے۔ اس افسانہ کو ان کے ناسٹیلجیا یعنی ماضی کی یادوں اور ان کے اخلاقی پہلوؤں سے جوڑ کر مزید وضاحت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔

احمد یوسف جب اپنے ماحول اور شہر کی حدود سے نکل کر اس وسیع وعریض دنیا کے دیگر معاملات ومسائل سے وابستہ ہوتے ہیں تو موضوعات کے ایک بڑے سلسلے سے ان کی آشنائی ہوتی ہے جہاں اپنی عصری حسیت کو بروئے کار لا کر وہ متعلقہ سلسلے کے جو بھی تجربات ومشاہدات اخذ کرتے ہیں انھیں اپنے

افسانوں کا پیراہن عطا کر دیتے ہیں۔

مثلاً احمد یوسف کا ایک افسانہ بعنوان 'وہ ایک شخص' تحریر کیا گیا ہے جو بیانیہ طرز اسلوب میں ہے۔ یہ افسانہ اپنے مرکزی کردار شہباز جیسے Feudal Lord کے سہارے جاگیردارانہ استحصال اور آمرانہ رویے کی داستان سناتا ہے۔ ظالم و مظلوم کے موضوع پر احمد یوسف کا افسانہ 'مکالمہ' ہے جہاں ظالم اور مظلوم کی منطق شیر اور میمنے کے توسط سے پیش کی گئی ہے یعنی شیر میمنے پر اس منطق کی بنیاد پر حملہ آور ہوتا ہے کہ میمنا اس کے پانی کو گندہ کر رہا ہے جس سے وہ اپنی پیاس بجھایا کرتا ہے۔ وہیں میمنا اپنے دفاع میں جو منطق پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ پانی اوپر سے نیچے آتا ہے نہ کہ نیچے سے اوپر جاتا ہے۔ اس افسانہ پر حکایت کا رنگ غالب ہے۔

احمد یوسف کا افسانہ 'صورت ایک بے کیفی کی' ایک تجریدی افسانہ ہے جو ایک مقام پر علامتی بھی ہو جاتا ہے۔ اس افسانہ میں بظاہر ایک تصویر ہے جس کی ہولناکی کو ختم کرنے کی خاطر ایک آرٹسٹ سے مدد لینے کی بات کی گئی ہے مگر ہزار کوشش کے باوجود تصویر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا اور اس کے ارادے قتل و غارت گری کے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اس تصویر کو پھاڑ کر ایک نئی تصویر بنانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہاں دراصل ہم جس نظام سے وابستہ ہیں اس میں بنیادی تبدیلی کی بات کی گئی ہے جہاں کے حالات یہ ہیں کہ وہاں محض اصلاح سے معاملات میں سدھار ممکن نہیں ہے۔

افسانہ 'ہوا یہ کہ ایک دن' ایک Fantasy ہے جو ایک رکشے والے اور ایک آفس کے بابو کے مابین روپے کی تکرار کے سہارے تکمیل پاتا ہے۔ یہاں روپے اور اس کے سرکولیشن کا مسئلہ زیر بحث لایا گیا ہے اور اس حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں مزدور کی محنت کا بڑا رول ہے۔ چنانچہ اس میں اضافے کا حقدار محنت کرنے والا ہے۔

احمد یوسف کے زیادہ تر افسانے بیانیہ طرز اسلوب میں نظر آتے ہیں مگر علامتی، تجریدی اور تمثیلی رنگ کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں بخوبی برتا ہے۔ محض یہی نہیں شعور کی رَو کے ساتھ حکایت اور داستانی رنگ سے بھی حسبِ ضرورت انھوں نے استفادہ کیا ہے۔

احمد یوسف کے جہانِ افسانہ سے نکلئے تو ان کی رپورتاژ کے مجموعہ 'محفل محفل' کا قصہ یہ ہے کہ وہاں عظیم آباد کے ساتھ دلی تک کی ادبی سرگرمیوں کے نہایت تخلیقی رنگ و آہنگ میں احوال نظر آتے ہیں۔ 'دل کے قریں رہتے ہیں' کے خاکے اس طور پر اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے توسط سے اردو ادب کے

بڑے شاعر و ادیب کے خاندانی احوال اور ان کے انداز و اطوار کے علاوہ ان کے علمی و ادبی کارناموں سے ہماری آشنائی ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ احمد یوسف کے والد محترم سے تعارف کا سامان بھی ہمیں فراہم ہو جاتا ہے۔ ان خاکوں میں احمد یوسف کا طرزِ اظہار لائق ستائش ہے۔

ناولٹ 'جلتا ہوا جنگل' میں عظیم آباد کے گزرے ہوئے دنوں کے قصے کی جہاں شمولیت ہے وہیں آزادی کے بعد مسلمانوں کی دور دیس کی منتقلی، ان کی حالتِ زار اور ان کے اجتماعی غور و فکر سے فرار کے نتیجے میں پیدا شدہ مسائل سے ہم بہر طور باخبر ہو جاتے ہیں۔

احمد یوسف کی دیگر کتابوں میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ اور بہار اردو اکادمی پٹنہ کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابوں میں 'بہار اردو لغت'، انگریزی سے اردو ترجمہ کا ایک کارنامہ 'وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں' اور 'مبارک عظیم آبادی' وغیرہ ہیں جہاں ان کے مخصوص میدان سے الگ بھی ان کی بہترین صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس طرح بطور مجموعی ان کی تحریروں کا عالم یہ ہے کہ ہر میدان میں موضوعات کے اعتبار سے ان کی مشقتیں عیاں ہیں جہاں ان کی زبان کے ساتھ ان کا دلکش اندازِ بیان دورانِ مطالعہ ڈوب جانے کے تقاضے کرتا ہے۔

❁

کتابیات

افسانوی مجموعے :

(۱) روشنائی کی کشتیاں ۔ ۱۹۷۶ء کلچرل اکیڈمی، گیا

(۲) آگ کے ہم سائے ۔ ۱۹۸۰ء پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ

(۳) ۲۳ گھنٹے کا شہر ۔ ۱۹۸۴ء پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ

(۴) رزم ہو یا بزم ہو ۔ ۲۰۰۴ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

رپوتاژ:

(۵) محفل محفل

(۹ رپورتاژ کا مجموعہ)۔ ۱۹۸۹ء پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ

خاکے:

(۶) دل کے قریں رہتے ہیں

(۱۳ خاکوں کا مجموعہ) ۔ ۲۰۰۷ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ناولٹ:

(۷) جلتا ہوا جنگل

(تین ناولٹ کا مجموعہ)۔ ۲۰۰۸ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

دیگر کتابیں:

(۸) بہار اردو لغت

(تقریباً تین ہزار الفاظ ومحاورات پر مبنی)۔ ۱۹۹۵ء خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

(۹) وہ جناح جنھیں میں جانتا ہوں

(ڈاکٹر سچدانند سنہا کی کتاب کا

انگریزی سے اردو ترجمہ)۔ ۱۹۹۶ء خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

(۱۱) مبارک عظیم آبادی۔ ۲۰۰۶ء بہار اردو اکادمی، پٹنہ

(۱۲) احمد یوسف کا افسانوی سفر/

ڈاکٹر سید عرفان ضیاء یوسف۔ ۲۰۱۶ء صائمہ پبلیکیشن، پٹنہ

ختم شد